

داعی رجوع الی القرآن بانی تنظیم اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمد
کے شہرہ آفاق دورہ ترجمہ قرآن پرمشتمل

بیان القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر
کی شہرہ آفاق پزیرائی اور مقبولیت
کے بعد اب پیش ہے:

مختصر
القرآن مجید
ترجمہ مع منتخب حواشی

مضبوط جلد
دیدہ زیب نائٹل
1248 صفحات

ویکس ایڈیشن: 4500 کے بجائے 2200 روپے
سٹینڈرڈ ایڈیشن: 2500 کے بجائے 1250 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور
36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-(042)35869501
maktaba@tanzeem.org 0301-1115348

قرنی ہوم ڈیلیوری
کے ساتھ

سلسلہ اشاعت کے 60 سال
ربیع الثانی 1438ھ
ستمبر 2016ء

بیثاق

ماہنامہ

کیے از مطبوعات
تنظیم اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ معاہدہ:
تواصی بالصبر از ڈاکٹر اسرار احمد
نبی اکرم ﷺ کے تعلق کے تقاضے
عظمت لا الہ الا اللہ
رحمۃ للعالمین ﷺ

اُمتِ مسلمہ کی نئی صف بندی یا امتحان؟
رحمۃ للعالمین ﷺ

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقْتُمْ بِكُمْ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (المائدة: ٤٠)
 ”اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے ميثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!“



جلد : 75
 شمارہ : 9
 ربیع الثانی 1448ھ
 ستمبر 2026ء
 فی شمارہ : 60 روپے
 سالانہ زیر تعاون : 600 روپے

مجلس ادارت
 • رضاء الحق • ایوب بیگ مرزا
 • خورشید انجم • وسیم احمد
 معاون مدیران
 • محمد خلیق • حافظ محمد زاہد

مدیر مسئول
 شجاع الدین شیخ
 مدیر اعزازی
 حافظ عاکف سعید
 مدیر
 حافظ خالد محمود خضر

رابطہ برائے ادارتی امور (042)38939321
 مرکز دفتر تنظیم اسلامی ”دارالاسلام“ ملتان روڈ چوہنگ لاہور
 (پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-35473375 (042)
 publications@tanzeem.org
 ویب سائٹ www.tanzeem.org , www.tanzeemdigitallibrary.com

مکتبہ خدام القرآن لاہور، 36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور 54700

فون: 3-35869501 (042) ، 0341-4941212
 ای میل: maktaba@tanzeem.org

پبلشر: سکریٹری دین حق ٹرسٹ لاہور مطبع: آر آر پرنٹرز، سگیاں روڈ لاہور

مشمولات

- 5 **عرض احوال** ✨
 مکہ معاہدہ: اُمتِ مسلمہ کی نئی
 صف بندی یا امتحان؟ رضاء الحق
- 9 **تذکرہ و تبصرہ** ✨
 نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق کے تقاضے شجاع الدین شیخ
- 27 **درس قرآن** ✨
 سُورَةُ الْبَقَرَةِ (۱۱) ڈاکٹر اسرار احمد
- 40 **ابوظبى سیریز (۶)** ✨
 تواسی بالصبر ڈاکٹر اسرار احمد
- 65 **نقوش سیرت** ✨
 رحمۃ تلعا لمین صلی اللہ علیہ وسلم حافظ محمد اسد
- 69 **ذکر و فکر** ✨
 عظمت لا الہ الا اللہ ڈاکٹر ربیعہ ابرار
- 83 **ظروف و احوال** ✨
 مکہ معاہدہ ایوب بیگ مرزا
- 92 **دعوت فکر** ✨
 قوی مومن بنیے! محمد عثمان عباس

”ادارہ“ کا مضمون نگار حضرات کی تمام آراء سے کامل اتفاق ضروری نہیں!

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مکہ معاہدہ: اُمتِ مسلمہ کی نئی صف بندی یا امتحان؟

ستمبر کا مہینہ ہر سال عالمی سفارت کاری کا مرکز بن جاتا ہے۔ نیویارک میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس، سلامتی کونسل کے مباحث، عالمی امن، انسانی حقوق، پائیدار ترقی اور بین الاقوامی تعاون کے خوش نما عروں سے دنیا کی فضا گونجنے لگتی ہے۔ طاقتور ممالک کے سربراہ ایک دوسرے سے مصافحے کرتے ہیں، مشترکہ اعلامیے جاری ہوتے ہیں اور دنیا کو ایک بہتر مستقبل کی نوید سنائی جاتی ہے۔ لیکن انہی ایوانوں سے ہزاروں میل دور غزہ کے طبع تلے دہلی انسانیت، فلسطین کے بے گھر خاندانوں، کشمیر کی خاموش وادیوں، سوڈان کے خون آلود میدانوں اور دیگر مظلوم خطوں کی آہیں ایک سوال بن کر ابھرتی ہیں کہ کیا عالمی امن صرف تقریروں کا موضوع رہ گیا ہے یا اس کے لیے کوئی حقیقی اخلاقی بنیاد بھی باقی ہے؟ یہ سوال صرف اقوام متحدہ سے نہیں بلکہ پوری انسانیت سے ہے اور سب سے بڑھ کر اُمتِ مسلمہ سے۔

ایسے وقت میں جب غزہ کی جنگ نے نہ صرف ہزاروں جانیں نگل لی ہیں بلکہ مشرق وسطیٰ کی سیاست کا رخ بھی بدل کر رکھ دیا ہے، خطے میں نئے اتحاد بن رہے ہیں۔ پرانے تعلقات از سر نو ترتیب پا رہے ہیں۔ عالمی طاقتیں آنے والے عشروں کے لیے اپنے اپنے مفادات کا نقشہ مرتب کر رہی ہیں، مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ اس پورے منظر نامے میں مسلمان اکثریت فیصلہ ساز نہیں بلکہ فیصلوں سے متاثر دکھائی دیتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ غزہ کی تباہی نے پوری دنیا پر ایک حقیقت آشکار کر دی ہے کہ جدید اسلحہ، سفارتی طاقت اور معاشی مفادات کے اس دور میں محض اخلاقی اپیلیں مظلوم قوموں کو انصاف نہیں دلا سکتیں۔ بین الاقوامی قانون کی باتیں اُس وقت تک مؤثر نہیں ہوتیں جب تک اُن کے پیچھے اجتماعی قوت، سیاسی عزم اور اخلاقی استقلال موجود نہ ہو۔ گزشتہ کئی برسوں میں بارہا یہ منظر سامنے آیا کہ سلامتی کونسل میں جنگ بندی کی قراردادیں زیر بحث آئیں، مگر ویٹو کی

سیاست نے اُنہیں روک دیا اور ظلم اپنی پوری شدت کے ساتھ جاری رہا۔

قرآن مجید سورۃ الحجرات، آیت ۱۰ میں جب اہل ایمان کو ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾ کہہ کر مخاطب کرتا ہے تو وہ محض ایک روحانی رشتہ بیان نہیں کرتا بلکہ ایک ایسی اجتماعی حقیقت کی بنیاد رکھتا ہے جس میں ایمان، سیاست، معیشت، تہذیب اور اجتماعی ذمہ داری ایک دوسرے سے جدا نہیں رہتے۔ مسلمانوں کی اصل طاقت اُن کے وسائل سے پہلے اُن کی وحدت تھی۔ جب تک یہ وحدت قائم رہی، اُمت نے دنیا کی قیادت کی، لیکن جب اللہ کی رسی کو ہاتھ سے چھوڑا گیا تو یہ وحدت منتشر ہو گئی۔ اقوام متحدہ کی عمارت کے سامنے آج دنیا کے تقریباً تمام ممالک کے پرچم لہراتے ہیں، لیکن اُمتِ مسلمہ کا کوئی مشترکہ پرچم نہیں۔ دوا رب سے زائد مسلمانوں کے باوجود کوئی ایسی متفقہ سیاسی حکمت عملی موجود نہیں جو عالمی سطح پر اُن کے اجتماعی مفادات کی ترجمانی کر سکے۔ آج اُمت تو موجود ہے مگر اُس کی اجتماعی قوت منتشر ہے۔

یہ انتشار صرف فلسطین تک محدود نہیں۔ کشمیر سے سوڈان تک، شام سے یمن تک، جہاں کہیں بھی مسلمان بحران کا شکار ہیں، وہاں اُمت کی بے بسی نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ اس کا سبب صرف بیرونی سازشیں نہیں بلکہ مسلمانوں کی داخلی کمزوریاں بھی ہیں۔ قومی مفادات نے اُمت کے اجتماعی تصور کو پس منظر میں دھکیل دیا، فرقہ واریت نے اخوت کو مجروح کیا اور معاشی انحصار نے سیاسی خود مختاری کو محدود کر دیا۔

اسی بدلتے ہوئے منظر نامے میں ۷ اگست ۲۰۲۶ء کو مکہ مکرمہ میں پاکستان، سعودی عرب اور ترکیہ کے درمیان ہونے والا مشترکہ دفاعی معاہدہ ایک اہم پیش رفت کے طور پر سامنے آیا ہے۔ یہ معاہدہ خطے کے بدلتے ہوئے سیاسی و ترقیاتی حالات میں ایک نئی سمت کی علامت بھی سمجھا جا رہا ہے۔ یہ معاہدہ اچانک وجود میں نہیں آیا بلکہ اس کی بنیاد پاکستان اور سعودی عرب کے درمیان طویل عرصے سے جاری دفاعی تعاون اور ستمبر ۲۰۲۵ء میں دونوں ملکوں کے درمیان طے پانے والے باہمی دفاعی معاہدے میں موجود تھی۔ بعد ازاں علاقائی حالات اور دونوں ملکوں کے مفادات نے اس دائرے کو مزید وسیع کرنے کی ضرورت پیدا کی اور ترکیہ کی شمولیت اسی عمل کا اگلا مرحلہ بنی۔ یوں پاکستان کی عسکری صلاحیت، ترکیہ کی فوجی و تکنیکی قوت اور سعودی عرب کی معاشی و جغرافیائی اہمیت ایک ہی دفاعی بندوبست میں جمع ہو گئی۔ اجتماعی دفاع

کی شق بظاہر نیٹو کے آرٹیکل ۵ سے مشابہ ہے، یعنی کسی ایک رکن پر حملہ مشترکہ خطرہ سمجھا جائے گا۔ تاہم اس کے عملی خدوخال ابھی تشکیل پانے کے مرحلے میں ہیں۔ ترکیہ کے مطابق تینوں ممالک سیاسی اور عسکری سطح پر اعلیٰ رابطہ کاری کا نظام قائم کریں گے۔ مشترکہ فوجی مشقیں ہوں گی اور زمینی، فضائی، بحری اور سامبر شجوں میں تعاون بڑھایا جائے گا۔ ڈرونز، الیکٹرانک وارفیئر، مصنوعی ذہانت اور دفاعی صنعت میں مشترکہ پیداوار اور ٹیکنالوجی کی منتقلی بھی اس تعاون کا حصہ ہوگی۔ اس طرح یہ معاہدہ صرف روایتی عسکری دفاع تک محدود رہنے کے بجائے جدید حربی تقاضوں کو بھی اپنے دائرے میں شامل کر سکتا ہے۔

معاہدے کے بعد ایک اہم سوال سامنے آیا کہ: کیا یہ نیا دفاعی بندوبست ایران کے خلاف بنایا گیا ہے؟ پاکستان کی حکومت نے اس تاثر کو واضح طور پر مسترد کیا۔ معاہدے کو خطے کے دوسرے ممالک کے لیے بھی کھلا رکھا گیا ہے۔ یہ وضاحت اس لیے بھی اہم تھی کہ پاکستان پہلے ہی ایران کے ساتھ کشیدگی کم کرنے کی کوششوں میں شریک رہا ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ سعودی عرب کے ساتھ اُس کا دفاعی معاہدہ ایران کے ساتھ براہ راست محاذ آرائی کا ذریعہ بن جائے۔ ایران کا ردِ عمل بھی اسی تناظر میں خاصا اہم رہا۔ معاہدے کے بعد ایرانی وزارتِ خارجہ کے ترجمان اسماعیل بقائی نے کہا کہ ایران کو اس معاہدے سے خوف زدہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ ایران کی جانب سے اس نسبتاً محتاط ردِ عمل نے بھی یہ تاثر مضبوط کیا کہ مکہ معاہدے کو فوری طور پر کسی نئے محاذ یا ایران مخالف فوجی اتحاد کے طور پر دیکھنا شاید قبل از وقت ہوگا۔ تاہم مکہ معاہدے کی اصل آزمائش بھی اسی مقام پر شروع ہوتی ہے۔ اگر کسی رکن ملک پر واقعی بڑا حملہ ہوتا ہے تو کیا باقی دونوں ممالک عملی فوجی مدد فراہم کریں گے؟

اس معاہدے کی ایک اور اہم جہت اس کا ممکنہ پھیلاؤ ہے۔ صدر رجب طیب اردوان نے مصر کی ممکنہ شمولیت کا ذکر کیا ہے۔ اگر مصر واقعی اس دائرے میں آتا ہے تو اس دفاعی بندوبست کی جغرافیائی اور سیاسی اہمیت مزید بڑھ سکتی ہے، کیونکہ پھر خلیج، جنوبی ایشیا، اناطولیہ اور شمالی افریقہ کی ایک بڑی مسلم طاقت ایک ہی وسیع تر دفاعی فریم ورک کا حصہ بن سکتی ہے۔

اس سارے معاملے کا حیران کن پہلو امریکی ردِ عمل ہے۔ بظاہر یہ توقع تھی کہ امریکہ اس دفاعی بندوبست کو دیکھ کر محتاط یا تشویش پر مبنی ردِ عمل ظاہر کرے گا، لیکن صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے

خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اسے ”بڑا جرات مندانہ اور پہلا اہم قدم“ قرار دیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امریکا فی الوقت مکہ معاہدے کو اپنے خلاف بننے والے کسی متبادل سیوریٹی نظام کے طور پر نہیں دیکھ رہا۔ دوسری طرف یہ بھی ممکن ہے کہ امریکا اس نئے بندوبست کو اپنی وسیع تر علاقائی حکمتِ عملی کے ساتھ متصادم نہیں سمجھتا، خصوصاً اس لیے کہ پاکستان، سعودی عرب اور ترکیہ تینوں ہی امریکا کے ساتھ مختلف سطحوں پر تعلقات رکھتے ہیں۔ تاہم عالمی سیاست میں مفادات بدلتے رہتے ہیں، ترجیحات تبدیل ہوتی رہتی ہیں اور حالات کے ساتھ اتحادوں کی نوعیت بھی بدل سکتی ہے۔

کیا مکہ معاہدہ اُمتِ مسلمہ کے منتشر وجود کو کسی مشترکہ قوت میں تبدیل کرنے کی جانب پہلا قدم بن سکتا ہے یا یہ بھی موجودہ علاقائی صف بندیوں کا ایک محدود مظہر بن کر رہ جائے گا؟ اس کا جواب آنے والے دنوں میں اس پر ہونے والی عملی پیش رفت دے گی۔ تینوں ممالک اگر اپنے دفاعی تعاون کو ادارہ جاتی شکل دیتے ہیں تو اس کے اثرات یقیناً دور رس ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ معاہدہ صرف مخصوص حالات سے نمٹنے یا چند ممالک کے باہمی مفادات کے تحفظ تک محدود رہ گیا تو اسے اُمت کی اجتماعی قوت کی بحالی کا نقطہ آغاز قرار دینا مشکل ہوگا۔ اُمت کی حقیقی قوت اُس اجتماعی شعور میں ہے جو مسلمانوں کو اپنے مشترکہ مسائل، مشترکہ مفادات اور مشترکہ ذمہ داریوں کا احساس دلاتا ہے۔ مکہ معاہدے کو صرف پاکستان، سعودی عرب اور ترکیہ کے تعلقات کے تناظر میں دیکھنا نا کافی ہے۔ اس میں اُمتِ مسلمہ کے لیے ایک بڑا سبق بھی پوشیدہ ہے۔ مسلمان اگر اپنی جغرافیائی، معاشی، افرادی، عسکری اور تہذیبی قوتوں کو باہمی تعاون کے لیے استعمال کریں تو اُن کے پاس بھی عالمی سیاست میں باوقار کردار ادا کرنے کے لیے وسائل کی کوئی کمی نہیں۔

غزہ نے ہمیں یہ سبق انتہائی کرب کے ساتھ دیا ہے کہ صرف تعداد طاقت نہیں بنتی، وسائل کا ہونا بھی کافی نہیں اور محض اخلاقی برتری بھی ظلم کو روکنے کے لیے ہمیشہ کافی نہیں ہوتی۔ قوت اُس وقت بنتی ہے جب وسائل، صلاحیت، نظم، سیاسی بصیرت، اجتماعی عزم اور واضح مقصد ایک سمت میں جمع ہوں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق کے تقاضے

شجاع الدین شیخ، امیر تنظیم اسلامی

خطبہ مسنونہ اور تلاوت آیات کے بعد!

اللہ تعالیٰ کو ہم مانتے ہیں اور بہت سے دوسرے لوگ بھی مانتے ہیں۔ یہودی بھی مانتے ہیں، نصاریٰ بھی مانتے ہیں لیکن وہ مسلمان نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں رکھتے۔ یہ سب سے پہلی اہم بات ہے۔ قانونی اعتبار سے وہ شخص مسلمان ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا آخری رسول مانے۔ یہودی اللہ کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں، آخرت کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانتے، لہذا وہ مسلمان نہیں۔ نصاریٰ اللہ کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں، آخرت کا اگرچہ بگڑا ہوا عقیدہ رکھتے ہیں مگر مانتے ہیں، لیکن وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں رکھتے اس لیے وہ ایمان والے نہیں ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول کی تصدیق

فقہاء نے اس بارے میں لکھا ہے کہ مسلمان کون ہے! ایمان کی تعریف کیا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق کے حوالے سے فقہاء نے اس بات کو بیان کیا کہ ایمان کس چیز کا نام ہے! تکنیکی طور پر اس کی تعریف یہ کی گئی: تصدیق بما جاء به النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ ہر وہ بات، ہر وہ خبر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمائی اس کی تصدیق کرنا ایمان ہے۔ میرا اور آپ کا ایمان اس بات پر قائم ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا آخری رسول مانتے ہیں اور ان کی بتائی ہوئی ہر بات کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہ سب سے پہلا اہم معاملہ ہے۔ کوئی اللہ کو ماننے کا دعویٰ کرے آخرت کو ماننے کا دعویٰ کرے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ کی ختم نبوت پر

☆ مدینہ منورہ میں حجاج کرام کے ایک نمائندہ اجتماع سے گفتگو

ایمان نہ رکھے تو وہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔ ایک ہے زبان سے اقرار کرنا، ایک ہے دل سے تصدیق کرنا۔ بچپن سے ہم نے ایمان بھل کے بارے میں پڑھا ہے:

آمَنْتُ بِاللَّهِ كَمَا هُوَ بِأَسْمَائِهِ وَصِفَاتِهِ، وَقَبِلْتُ جَمِيعَ أَحْكَامِهِ، إِفْرَازَ
بِاللِّسَانِ وَتَصْدِيقًا بِالْقَلْبِ

”میں اللہ پر ایمان لایا جیسا کہ وہ ہے اپنی ذات و صفات کے ساتھ اور میں نے اُس کے تمام احکام کو قبول کیا، زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کرتے ہوئے۔“

قرآن حکیم مسلمانوں کو کہتا ہے کہ اللہ کے رسول پر ایمان لاؤ:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾ (النساء: ۱۳۶)

ایمان والوں سے بھی ایمان لانے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ ایک ایمان زبان کی نوک تک محدود ہوتا ہے جبکہ ایک ایمان دل میں ہوتا ہے۔ یہاں اُس ایمان کا تقاضا کیا جا رہا ہے۔ جب دل سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان ہوگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت بھی ہوگی، ادب اور احترام بھی ہوگا، تعلیمات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر یقین بھی ہوگا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اتباع بھی ہوگی۔ بندہ مؤمن کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن اور جدوجہد سے بھی نسبت ہوگی۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق کے تقاضوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ چنانچہ ایمان کے بارے میں تو یہ بات ہمارے سامنے آگئی کہ زبان کا اقرار کافی نہیں بلکہ دل کی تصدیق بھی ضروری ہے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت

قرآن کریم میں بتایا گیا:

﴿الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَمِنْهُمْ مَن يَخُصُّ إِلَهُهُ﴾ (الاحزاب: ۶)

”نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایمان والوں کے نزدیک ان کی جانوں سے بڑھ کر عزیز اور مقدم ہیں۔“

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَ وَلَدِهِ وَ النَّاسِ

أَجْمَعِينَ)) [صحیح البخاری: ۱۵]

”تم میں سے کوئی اُس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والد اس کی اولاد اور سارے انسانوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں۔“

انسانوں سے بڑھ کر والد سے بڑھ کر اولاد سے بڑھ کر جب تک اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم

محبت نہ ہو ایمان مکمل نہیں۔ اس سے اگلی بات بھی بخاری شریف کی ایک حدیث میں آتی ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: ”تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو؟“ انہوں نے دل کی بات عرض کر دی: ”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میری جان کے سوا باقی ہر شے سے بڑھ کر آپ سے محبت ہے۔“ اس پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اے عمر! ابھی تمہارا ایمان مکمل نہیں۔“ سیدنا عمرؓ خاموش ہوئے، کچھ توقف کیا اور کچھ دیر کے بعد سوچ سمجھ کر عرض کی: ”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اب مجھے میری جان سے بڑھ کر آپ سے محبت ہے۔“ تب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((الآن یا عمر)) ”اے عمر! اب تمہارا ایمان مکمل ہوا۔“ یہ اصولی بات ہے کہ ہمیں ہماری جان سے بڑھ کر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنی ہے۔ یہ ایمان کا تقاضا ہے۔ سورۃ التوبہ کی آیت ۲۴ میں آٹھ محبتوں کا ذکر ایک طرف ہے اور تین محبتوں کا ذکر دوسری طرف فرمایا:

﴿قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ ۖ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسْكَنٌ تَرْضَوْنََهَا﴾
 ”(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) فرمادیجیے: اے لوگو! اگر تمہیں تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے بڑی محنت سے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے نقصان کا تمہیں اندیشہ رہتا ہے اور وہ مکانات (اور محلات) جو تمہیں بڑے محبوب ہیں“

یہ آٹھ محبتیں آگئیں: باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں، رشتہ دار، مال، تجارت، گھر بار۔
 ﴿أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ ۚ﴾

”اگر تمہیں محبوب تر ہیں اللہ سے اور اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے تو جاؤ انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ لے آئے۔“

﴿وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۝﴾

”اور اللہ فاسقین کی قوم کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔“

ہمارے استاد ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ بندہ اپنے باطن میں ایک تر از و نصب کرے۔ ایک پلڑے میں آٹھ محبتیں رکھو: باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں، رشتہ دار، مال، تجارت،

گھر بار (جن کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا ہے ”یہ مال و دولت دنیا، یہ رشتہ و پیوند“۔ دوسرے پلڑے میں اللہ کی محبت، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور اللہ کی راہ میں جہاد کی محبت رکھو۔ پھر دیکھو کون سا پلڑا بھاری ہے! اگر گھر والوں کی محبت، مال کی محبت، تجارت کی محبت، دنیا کی محبت کا پلڑا غالب ہے، جھکا ہوا ہے تو پھر جاؤ انتظار کرو اللہ کے فیصلے کا، موت آجائے یا عذاب آجائے ایسے فاسقوں کو اللہ ہدایت نہیں دیتا۔ اگر دوسرا پلڑا بھاری ہے تو یہ ایمان والوں سے مطلوب ہے۔ اس آیت میں غور و فکر کا سامان ہے۔ کیا ہماری محبت سب سے بڑھ کر اللہ کے لیے ہے؟ قرآن فرماتا ہے:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ﴾ (البقرہ: ۱۶۵)

”اور جو واقعتاً ایمان والے ہوتے ہیں ان کی شدید ترین محبت اللہ کے ساتھ ہوتی ہے۔“

ہم اہل ایمان کے لیے لمحہ فکر یہ ہے کہ کیا واقعی ایسا ہے؟ شب و روز کے معاملات میں بڑے مواقع آتے ہیں۔ جب برادری کا چال چلن، رسم و رواج کا کوئی معاملہ اوپر آ جاتا ہے تو دین نیچے چلا جاتا ہے۔ نفس کی خواہشات کے مطابق بات اوپر آ جاتی ہے جبکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نیچے چلی جاتی ہے۔ شادی بیاہ کے موقع پر سنت کی تعلیم کو پامال کرتے ہیں جبکہ بے حیائی، بے پردگی، ناچ گانا، ہلا گلا نمایاں ہو جاتا ہے۔ غور کرنا چاہیے کہ کیا واقعی اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہمارے نزدیک تمام محبتوں پر priority پر ہے! ٹاپ پر ہے؟ چنانچہ پہلی بات یہ کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بھی ایمان کا تقاضا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب

اگلی بات یہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب، احترام، عزت، تعظیم بھی ایمان کا تقاضا ہے۔ روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضری دیں تو وہاں بھی لکھا ہوتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ

بِالنَّوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ۝﴾

(الحجرات)

”اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آواز سے بلند نہ کرنا، اور ان کے سامنے اس طرح بلند آواز سے باتیں نہ کرنا جیسے ایک دوسرے کے سامنے (ہلکے انداز

ماہنامہ ميثاق (12) ستمبر 2026ء

ماہنامہ ميثاق (11) ستمبر 2026ء

میں) کر لیتے ہو، مبادا تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں شعور بھی نہ ہو۔“

بندے کو یہ معلوم ہو کہ اس نے گناہ کیا ہے تو وہ توبہ کرنے کی کوشش کر لے گا۔ اگر بندے کو یہ احساس ہی نہیں کہ میری نیکیاں برباد ہو گئیں تو ایسی صورت میں توبہ کیسے کرے؟ اللہ کے رسول ﷺ کے ادب کے بارے میں یہ قرآن پاک کی حساس ترین آیت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف کرے، مسجد نبوی میں بھی آوازیں بلند ہوتی ہیں، روضہ رسول پر بھی آوازیں بلند ہوتی ہیں، چیخنا چلانا ہو جاتا ہے، موبائل کھلے ہوتے ہیں، گپ شپ چل رہی ہوتی ہے۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک لوہار نے مسجد نبوی کے قریب دکان کھولی۔ لوہے پر ہتھوڑے کی چوٹیں لگانے سے سارا دن شور پیدا ہوتا۔ چنانچہ سیدنا عمرؓ نے اس کو حکم دیا کہ دکان دور لے کر جاؤ، ادھر آوازیں نہیں آنی چاہیے۔ اسی طرح مدینہ منورہ سے باہر سے کچھ لوگ آئے، تو مسجد نبوی میں ان کی آوازیں بلند ہو گئیں۔ سیدنا عمرؓ نے فرمایا: ”اگر تم مدینہ شریف کے ہوتے تو تمہیں کوڑے لگواتا۔ اپنی آواز کو پست رکھو، یہ اللہ کے رسول ﷺ کے ادب و احترام کا تقاضا ہے۔“ چنانچہ فرمایا گیا کہ اگر تمہاری آواز نبی اکرم ﷺ کی آواز سے بلند ہو گئی یا اگر تم رسول اللہ ﷺ سے ایسے کلام کرو جیسے عام طور پر ایک دوسرے کے ساتھ کر لیتے ہو تو نیکیاں برباد ہو جائیں گی۔

ذرا غور کیجیے۔ ہمارے ہاں بعض مرتبہ اللہ کے رسول ﷺ کا نام لیا جاتا ہے تو لوگ ”صلی اللہ علیہ وسلم“ صحیح طریقے سے نہیں کہتے۔ اچھے بھلے لوگوں کو دیکھا گیا کہ کہتے ہیں: نبی صلعم۔ یہ ”صلعم“ کیا ہوتا ہے؟ ایک مہمل لفظ ہے۔ ﷺ کہنے میں کتنا وقت لگتا ہے؟ یہ بھی بے ادبی ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کی احادیث بیان کی جا رہی ہوں تو ان کو بھی توجہ سے سننا چاہیے۔ اگر اس کے دوران بے ادبی ہوگی تو بڑا گناہ کا معاملہ ہو جائے گا۔ کہیں کسی سے بحث ہوگئی، سامنے والے نے دلیل کے طور پر رسول اللہ ﷺ کی حدیث پیش کر دی، تو اب ہمیں خاموش ہو جانا چاہیے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی بات اوپر رہے گی، ہماری بات نیچے رہے گی۔ ہمارے ایمان اور ادب کا تقاضا ہے کہ ہم خاموشی اختیار کر لیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کی آواز سے آواز بلند ہو جائے اور ان کے سامنے کوئی بے ادبی کا معاملہ ہو جائے تو نیکیاں برباد ہو جائیں گی۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جو لوگ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات اور احکامات کا مذاق

اڑائیں، سنتوں کا مذاق اڑائیں، دائرہ کا مذاق اڑائیں، پردے کا مذاق اڑائیں تو ایسے لوگوں کا انجام کیا ہوگا! یہ ہے ایمان کا اگلا تقاضا کہ اللہ کے رسول ﷺ کا ادب اور احترام بھی پیش نظر رہے۔ اس موضوع پر قرآن کریم کی حساس ترین آیت سورۃ الحجرات کی آیت ۲ ہے۔

رسول اکرم ﷺ کی اطاعت

اللہ کے رسول ﷺ پر ایمان کا تقاضا آپ کی اطاعت کرنا بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دل کی آمادگی کے ساتھ اللہ کے رسول ﷺ کے احکام پر عمل کرنا۔ اللہ کے رسول ﷺ کے احکامات کیا ہیں؟ آپ ﷺ قرآن لے کر آئے۔ آپ ﷺ کے ارشادات احادیث مبارکہ کی روشنی میں ہمارے پاس موجود ہیں۔ پڑھیں گے، سمجھیں گے تو پتہ چلے گا کہ کس کام کے کرنے کا حکم دیا گیا اور کس کام سے روکا گیا۔ فرمان الہی ہے:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً مِّنَ رَبِّكَ وَمَا تَنهَىٰ عَنْهُ فَأَتَيْنَاكَ﴾ (الحشر: ۷)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ خود حکم دے رہا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ تمہیں جس بات کا حکم دیں، اسے مانو اور عمل کرو، جبکہ جس بات سے روک دیں، اس سے رُک جاؤ اور باز آ جاؤ۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے متعدد مرتبہ یہ بات ارشاد فرمائی ہے:

﴿أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ﴾

”اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔“

گیارہ مرتبہ تو یہ الفاظ آئے البتہ سورۃ النساء میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ﴾ (آیت ۸۰)

”جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔“

اللہ تعالیٰ نے براہ راست مجھے اور آپ کو قرآن نہیں دیا۔ اللہ تعالیٰ نے براہ راست مجھ سے اور آپ سے کلام نہیں کیا۔ اللہ نے رسول ﷺ کے قلب مبارک پر قرآن کریم کو نازل کیا۔ رسول اللہ ﷺ کے ذریعے قرآن کی تشریح ہم تک پہنچائی۔ چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت ہوگی تو اللہ کی اطاعت ہوگی۔ نماز کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

﴿اقِمُْوا الصَّلَاةَ﴾

”نماز قائم کرو۔“

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِي أَصَلِّ)) (صحیح البخاری)

”نماز ایسے ادا کرو جیسے مجھے نماز ادا کرتے ہوئے دیکھتے ہو۔“

نماز اللہ تعالیٰ کے لیے ادا کرتے ہیں، طریقہ رسول اللہ ﷺ سے لیتے ہیں۔ یوں نماز ادا ہوگی تو اللہ کے حکم پر عمل ہوگا۔ نوٹ کیجیے کہ یہ دو باتیں یعنی اللہ کا حکم رسول ﷺ کا حکم اور اللہ کی اطاعت رسول ﷺ کی اطاعت، شمار میں دو باتیں ہیں لیکن حقیقت میں ایک ہی بات ہے۔ رسول ﷺ کی مانیں گے تو اللہ کی اطاعت ہوگی، رسول ﷺ کی اطاعت کریں گے تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہوگی۔ یہ دونوں باتیں آپس میں جڑی ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عبادات کا حکم دیا ہے، حلال کمانے کا حکم دیا ہے، سچ بولنے کی تعلیم دی ہے، نکاح کی تعلیم دی ہے جبکہ اس کی تفصیلات اللہ کے رسول ﷺ نے بتائی ہیں۔ چنانچہ وہ تعلیمات سیکھیں گے تو اطاعت ہوگی۔ کامیابی کس کے لیے ہے؟ خطبہ نکاح میں جو آیات تلاوت کی جاتی ہیں ان میں سورۃ الاحزاب کی آیات ۷۰ اور ۷۱ بھی شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ۝۷۱﴾

”اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا وہ عظیم کامیابی حاصل کرے گا۔“

اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں میں ہمیں بھی شامل فرمائے!

ہم سب چاہتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کی شفاعت حاصل ہو جائے۔ یہاں حاضری نصیب ہوگئی، کل اللہ ان کی شفاعت بھی ہمیں عطا فرمائے۔ ہم چاہتے ہیں ان کے ہاتھوں سے جام کوثر پیئیں۔ لمحہ فکریہ ہے کہ کچھ لوگوں کے بارے میں اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ جنت میں داخل ہونے سے انکار کر دیں گے۔ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((كُلُّ أُمَّتٍ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ أَبَى)) ”میرا ہر امتی جنت میں داخل ہوگا سوائے اُس کے جس نے انکار کیا۔“ عرض کی گئی: حضور ﷺ! انکار کون کرے گا؟ فرمایا: ((مَنْ أَطَاعَنِي دَخَلَ الْجَنَّةَ، وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ أَبَى)) ”جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا، اور جس نے میری نافرمانی کی (میرے حکم کی خلاف ورزی کی) اُس نے انکار کیا۔“ ایسے لوگ اللہ کے رسول ﷺ کی شفاعت سے محروم

ہو جائیں گے، جام کوثر سے محروم ہو جائیں گے، جنت سے محروم ہو جائیں گے۔ مجھے اور آپ کو باعمل مسلمان بننا ہے۔ یہ تب ہوگا جب ہم قرآن کی محفلوں میں بیٹھیں گے، جب ہم دین کی محفلوں میں بیٹھیں گے۔ جب ہم دین کو سیکھیں گے تو پتہ چلے گا یہ do's (کرنے والے کام) ہیں، یہ don'ts (نہ کرنے والے کام) ہیں۔ ان سے اللہ راضی ہوگا، ان سے اللہ ناراض ہوگا۔ اس بات کے کرنے کا رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا اور اس سے منع کیا۔ یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ حج جیسے عظیم سفر پر بھی لوگ آگے مگر بنیادی باتیں سیکھ کر نہیں آئے۔ طواف کے چکروں کی اور سعی کے چکروں کی صحیح تعداد نہیں پتہ۔ اللہ اکبر! اللہ اکبر! اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت میں پوری زندگی گزارنی ہے تو ڈرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے!

رسول اکرم ﷺ کو فیصلہ ساز ماننا

ایمان کا اگلا تقاضا یہ ہے کہ اپنے معاملات کو رسول اللہ ﷺ کے حوالے کریں۔ ان میں اللہ کے رسول ﷺ کو فیصلہ دینے والا مانیں۔ جو فیصلے وہ فرما چکے، جو احکامات ہمیں عطا کر چکے ان کو دل و جان سے مان کر عمل کیا جائے، ورنہ ہمارا ایمان کامل نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيْ

أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝۵۵﴾ (النساء: ۵۵)

”(اے نبی ﷺ!) آپ کے رب کی قسم! یہ ایمان والے ہرگز نہ ہوں گے جب تک

کہ اپنے معاملات میں آپ کو فیصلہ ساز تسلیم نہ کریں، پھر جو فیصلہ آپ فرمادیں، اس کے

بارے میں دل میں کوئی تنگی بھی محسوس نہ کریں، اور مکمل طور پر اپنے آپ کو آپ کے حکم

کے سامنے جھکا دیں۔“

سود کو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ نے حرام قرار دیا۔ آج مسلمان کہہ رہا ہے کہ سود کے بغیر گزارا کیسے ہوگا! بے حیائی کو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ نے حرام کیا۔ پردے کا حکم اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے دیا۔ مسلمان کا روبرو کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہم اپنی ایڈورٹائزمنٹ میں عورت کو اگر نہیں دکھائیں گے تو ہماری پروڈکٹ نہیں بکے گی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَيْہِ رَاجِعُونَ! رمضان اگر گرمی میں آجائے تو کہتے ہیں کہ اللہ نے یہ بڑا سخت حکم دے دیا روزے کا۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے معاملات میں فیصلہ اللہ کے رسول ﷺ سے لو اور دل میں کوئی تنگی محسوس نہ

کرو۔ پورے طور پر اپنے آپ کو اللہ کے رسول ﷺ کے حکم کے سامنے جھکا دو۔ جب تک یہ نہ ہو تمہارا ایمان مکمل نہیں!

رسول اللہ ﷺ کا اتباع

قرآن کریم ایک اور لفظ ”اتباع“ استعمال کرتا ہے۔ ایک ہے اطاعت یعنی دل سے حکم ماننا۔ کرنے کا کام ہو تو اس پر عمل کرنا ہے۔ نہ کرنے والا کام ہو تو اس سے رُکنا اور باز آ جانا ہے۔ یہ کم سے کم تقاضا ہے۔ ہمارے بچے کسی تعلیمی امتحان میں ۱۰۰ میں سے ۴۰ نمبر لے آئیں تو پاس ہوں گے۔ اے لیولز والوں کے ۶۰ فیصد نمبر آئیں گے تو پاس ہوں گے۔ کیا ہم پسند کریں گے کہ بچہ ۴۰ فی صد نمبر کی تیاری کر کے امتحان دے؟ اس کے برعکس اللہ کے دین کے بارے میں ہمارا رویہ یہ ہے کہ یہ فرض تو نہیں ہے نا! اللہ کے حکم کے معاملے میں ہم ڈسکانٹ اور رعایت کے بارے میں سوچتے ہیں جبکہ بچہ اپنے امتحان میں ۱۰۰ میں سے ۱۰۱ نمبر لے کر آئے۔ تنخواہ ایک لاکھ ہے تو فوراً دو لاکھ ہو جائے اور معاملہ یوں ہی آگے بڑھتا رہے۔ دنیاوی امور میں اوپر سے اوپر آگے سے آگے جبکہ اللہ کے دین کے معاملے میں کم سے کم پر اکتفا کرنا؟ اللہ اور رسول ﷺ کے احکام پر پوری طرح عمل تو ناگزیر ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر قرآن پاک کہتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا اتباع بھی کرو۔ اللہ کی محبت کا معیار کیا ہے؟ فرمایا گیا:

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ﴾

(آل عمران: ۳۱)

اے نبی ﷺ! ان سے فرما دیجیے اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو اللہ سے محبت کا دعویٰ ہے تو میرا اتباع کرو مجھے follow کرو میرے نقش قدم پر آؤ۔ اس کے نتیجے میں اللہ تم سے محبت فرمائے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا۔ اللہ سے محبت کرنے کی شرط یہ ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ کا اتباع کرو۔

یہ سمجھ لیں کہ اتباع کا تعلق فقط احکام سے نہیں پوری زندگی سے ہے۔ پوری زندگی میں اللہ کے رسول ﷺ کے پیچھے پیچھے آنا۔ شادی بیاہ کے کارڈ جب اردو میں چھپتے تھے تو لکھا ہوتا تھا: نکاح مسنونہ، ولیمہ مسنونہ۔ یہ امر مختصر ہے کہ نکاح اور ولیمہ کا تعلق سنت سے ہے۔ اب کارڈ انگریزی میں آگئے تو وہاں نکاح مسنون نہیں لکھا ہوتا۔ ہم دور چلے گئے۔ نکاح ہو تو پتہ چلنا

چاہیے کہ حضرت محمد ﷺ کے کسی اُمتی کے گھر میں ہو رہا ہے۔ کیا آج مسلمانوں کے نکاح کی تقریبات کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے؟ اگر میت ہو جائے تو پتہ چلے کہ مسلمان کے گھر میں کوئی فوت ہوا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے بیٹے چھوٹی عمر میں انتقال کر گئے۔ تین بیٹیاں آپ ﷺ کی زندگی میں بڑی ہو کر انتقال کر گئیں۔ اس اعتبار سے غور کیجیے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے تو میت کے لیے بھی ہمیں اُسوہ عطا کیا۔ اسی طرح شب و روز کے معاملات ہیں۔ لباس کا معاملہ ہے، گفتگو کے آداب ہیں، اخلاق کا معاملہ ہے، پردے کے احکامات ہیں، کاروبار کے معاملات ہیں، وراثت کے احکامات ہیں، حلال کمائی کے معاملات ہیں۔ بد اخلاقی، جھوٹ اور وعدہ خلافی سے بچنے کی بات ہے۔ یہ ساری تعلیمات اللہ کے پیغمبر ﷺ ہمیں دے کر گئے ہیں۔

سنت رسول ﷺ کی پیروی

اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی محبت کا معیار بھی بیان کیا۔ جامع ترمذی کی روایت ہے اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ أَحَبَّ سُنَّتِي فَقَدْ أَحَبَّنِي، وَمَنْ أَحَبَّنِي كَانَ مَعِيَ فِي الْجَنَّةِ))

”جس نے میری سنت سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔“

ہم اور آپ غور کریں کہ کیا آج ہمارے گھروں میں شادی بیاہ کے موقع پر میت کے موقع پر کاروبار کے موقع پر لوگوں سے ڈیل کرتے ہوئے بڑوں اور چھوٹوں کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے اللہ کے نبی ﷺ کی سنتوں پر عمل دکھائی دیتا ہے؟

ایک اور حدیث سمجھیے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے بہترین اہل ایمان (خِیَارُکُمْ) کی تعریف بایں الفاظ بیان فرمائی:

((الَّذِينَ إِذَا رُؤُوا دُكِرَ اللَّهُ عَزَّوَجَلَّ)) (رواہ احمد و ابن ماجہ)

”وہ لوگ جنہیں دیکھ کر اللہ یاد آتا ہے۔“

غور کریں، کیا آج کے مسلمان کو دیکھ کر لوگوں کو اللہ یاد آتا ہے؟ ہماری گفتگو، اعمال، کردار، شب و روز کے معاملات کو دیکھ کر اللہ یاد آتا ہے؟ یا پھر لوگ ہماری حرکتوں کو دیکھ کر اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ اس حدیث کی تشریح میں ایک جملہ عرض کر رہا ہوں کہ اُمتی وہ ہوگا جسے دیکھ کر رسول ماہنامہ میثاق (18) ستمبر 2026ء

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یاد آئیں۔ کیا آج اُمتِ مسلمہ کے افراد کو دیکھ کر لوگوں کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یاد آتے ہیں؟

اقامتِ دین کی جدوجہد

اب تک کے تمام معاملات انفرادی نوعیت کے تھے۔ اس سے بڑھ کر وہ بات ہے جسے انگلش میں کہتے ہیں: Never settle for less (کبھی کم پر راضی نہ ہوا!) میں اس میں اضافہ کرتا ہوں کہ Rather go for the best (بلکہ بہترین کے لیے جاؤ!) خوب سے خوب تر کی تلاش بہتر سے بہترین کی طرف توجہ! سنت میں خوب ترین سنت کیا ہے؟ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آخری رسول کی حیثیت میں تشریف لائے۔ اللہ نے ایک مشن دیا تھا جو آج اُمت بھول گئی۔ قرآن کریم تین مرتبہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو بیان فرماتا ہے:

﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ﴾

(التوبة: ۳۳، الفتح: ۲۸، الصف: ۹)

اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا الہدیٰ یعنی مکمل ہدایت نامہ (قرآن) دے کر، The Complete Guidance دے کر، اور دینِ الحق دے کر، مکمل نظامِ زندگی دے کر تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس دینِ حق کو تمام نظامِ ہائے زندگی پر غالب فرمادیں۔ سورۃ الصف کی آیت میں آخری الفاظ ہیں:

﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ﴾

”چاہے مشرکین کو کتنا ہی ناگوار گزرے۔“

یہ آیتیں آج ہمارے ہاں بیان نہیں ہوتیں۔ اول تو ہم قرآن کو ترجمے کے ساتھ پڑھتے ہی نہیں ہیں۔ میٹھی میٹھی باتیں تو آرام سے بیان ہوتی ہیں۔ فضائل کی باتیں بھی آتی ہیں۔ فضیلت کے لیے نوافل ادا کرتے ہیں۔ درود شریف کا بھی اہتمام کرتے ہیں اور تلاوتِ قرآن کا بھی۔ البتہ فضائل سے آگے مسائل کا بیان بھی اور مسائل سے آگے بڑھ کر نظام کا بیان بھی ہونا چاہیے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ۲۳ برس کا مشن کیا ہے؟ اللہ کے عطا کردہ قرآن حکیم کے احکام کا نفاذ۔ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ دین کا قیام۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ۲۳ برس کی جدوجہد میں صرف نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، نوافل، عمرہ، قربانی، تسبیحات اور صدقات و خیرات ہی نہیں بلکہ اس ماہنامہ میثاق (19) ستمبر 2026ء

جدوجہد کے دوران میں مکہ مکرمہ میں راستوں میں کانٹوں کا بچھایا جانا بھی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ کے پاس حالتِ سجدہ میں تھے تو اونٹ کی اوجھڑی جسمِ اطہر پر ڈالی گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مجنون اور نہ جانے کیسے کیسے برے القابات سے پکارا گیا۔ شعب ابی طالب میں تین سال تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے خاندان والوں کو محصور کر دیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر دست درازی اور شہید کرنے کی ناپاک کوششیں بھی ہوئیں۔ طائف کی گلیوں میں خونِ اطہر بہا۔ مشرکین مکہ نے زندگی اس قدر اجیرن کر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشک بار آنکھوں سے مکہ مکرمہ کو الوداع کہا اور مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی۔ ہم تو بسوں میں بیٹھ کر چند گھنٹوں میں مدینہ پہنچ گئے جبکہ اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کئی دن تک اونٹ پر سوار رہے الگ الگ راستے اختیار کیے اور مشقتوں کو جھیلا۔ مدنی زندگی کا دور آ گیا تو قتال کے احکامات بھی آ گئے۔ بدر میں بھی تلوار اٹھی، اُحد کا بھی میدان سجا۔ اُحد میں ۷۰ صحابہ شہید ہوئے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا خونِ اطہر بہا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دندانِ مبارک شہید ہوئے، خود کی کڑیاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ انور میں داخل ہو گئیں، جنہیں نکالا گیا تو خون کا فوارہ جاری ہوا، بے ہوشی کی کیفیت طاری ہوئی۔ اُمت کی ماں سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ دودھ مہینے ہمارے گھر میں چولہا نہیں جلتا تھا۔ غزوہٴ احزاب کے موقع پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیٹ پر پتھر بھی باندھے۔ ۲۳ برس کی جدوجہد کے دوران ۲۵۹ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جانیں پیش کیں۔ تب اللہ کا دین غالب ہوا۔ فرمانِ الہی ہے:

﴿قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا﴾ (بنی اسرائیل)

”آپ کہہ دیجیے: حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، بے شک باطل ہے ہی مٹنے کے لیے۔“

﴿وَرَأَيْتُ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا﴾ (النصر)

”اور تم دیکھو گے لوگ جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔“

یہ فتح مکہ کی طرف اشارہ ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن دعوتِ دین کا کام اللہ کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد کرنا، یہ آج ہم بھول گئے ہیں۔ بس مسواک کر لی، خوشبو لگا لی، داڑھی رکھ لی، ٹوپی سر پہ سجالی تو سمجھا کہ سنت پوری ہو گئی۔ یہ سب مبارک سنتیں سر آنکھوں پر، مگر سنت یہاں تک محدود نہیں۔ طائف کی گلیوں میں بھی سنت دکھائی دے گی۔ ہجرت کی راتوں میں بدر اُحد کے میدان میں اور حنین و تبوک کے غزوات میں بھی سنت دکھائی دے گی۔ یہ ساری محنت ماہنامہ میثاق (20) ستمبر 2026ء

اس لیے تھی کہ اللہ کا نظام قائم ہو۔ اللہ کے احکام اُس کی زمین پر نافذ ہوں۔ یہ مشن تھا رسول اکرم ﷺ کا۔ ختم نبوت کے بعد یہ ذمہ داری میرے اور آپ کے کاندھوں پر ہے۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہم رسول اکرم ﷺ کے اُمتی ہیں، مگر اس خوش نصیبی کے ساتھ بھاری ذمہ داری بھی ہمارے کاندھوں پر ہے۔ بقول علامہ اقبال۔

وقتِ فرصت ہے کہاں، کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے!

اور۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں!

اُمتِ مسلمہ کی حالتِ زار

ایک کڑوی اور سخت بات آپ کے سامنے رکھوں۔ آج زمین پر سب سے زیادہ خون کس کا بہ رہا ہے؟ مسلمانوں کا۔ پچھلے ۱۰۰ برس دیکھ لیں۔ کشمیر، فلسطین کے مسئلے کو ۸۰ برس ہونے کو آئے۔ سب سے زیادہ خون ہمارا بہا۔ افغانستان میں بہا، عراق میں بہا، برما میں بہ رہا ہے، چیچنیا میں بہا، بوسنیا میں بہا، آج فلسطین اور غزہ کی گلیوں میں بہ رہا ہے۔ بہت توجہ کیجیے گا، بڑی سخت بات ہے: کیا اللہ تعالیٰ کو ہم پر رحم نہیں آتا؟ کیا ہم اُس کے ماننے والے نہیں؟ اس کے پیغمبر ﷺ اور اُس کی کتاب کے ماننے والے نہیں؟ کیا ہم آخری اُمت میں شامل نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ اُمت نے اُمت والے کام کو چھوڑا، اُس لیے دنیا میں ذلیل و رسوا ہے۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلمان ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآن ہو کر!

اللہ کے رسول ﷺ نے قرآن مجید کی محض تلاوت کر کے اسے فقط سنایا نہیں بلکہ اس کو قائم اور نافذ کر کے دکھایا۔ اگر قرآن نے قصاص کا حکم دیا تو یہ حکم نافذ کر کے دکھایا۔ اگر قرآن کریم میں ڈاکوؤں، رہزنیوں، چوروں کے بارے میں سزائیں ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے وہ نافذ کر کے دکھائیں۔ زکوٰۃ اور عشر کے احکامات حضور ﷺ اور خلفائے راشدین نے نافذ کر کے دکھائے۔ آج ہم روئے ارضی پر کوئی ایک ملک بتا سکتے ہیں جہاں اسلام نافذ ہو؟ اس

ملک میں بھی جہاں ہم بیٹھے ہیں، بینکنگ سسٹم میں سود موجود ہے۔ پاکستان میں تو ہے ہی سود کا دھندا! قرآن کہتا ہے:

﴿فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِمَحْذَرٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِۦ﴾ (البقرة: ۲۷۹)

”پھر اگر سود کے معاملات کو نہیں چھوڑتے تو اللہ اور اُس کے رسول (ﷺ) سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ!“

جنگ کا مطلب عمومی تباہی جبکہ اللہ سے جنگ کا مطلب مکمل تباہی و بربادی۔ ایک خطہ زمین ہم دنیا کے سامنے ایسا پیش نہیں کر سکتے کہ آؤ دیکھو یہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا دیا ہوا نظام ہم نے قائم کر دیا ہے۔ آج ہماری رسوائی کی یہ وجہ ہے۔

پاکستان ہم نے کیوں بنایا تھا؟ فلموں، ڈراموں، ناچ گانوں کے لیے؟ سود کے دھندوں کے لیے؟ یہ سب کچھ بھارت میں کم ہے کیا؟ دنیاوی ترقی بھارت میں کم ہوئی ہے کیا؟ ہم نے پاکستان اس نعرے کی بنیاد پر حاصل کیا تھا: ”پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ!“ کہاں ہے وہ لا الہ الا اللہ؟ زبان پر تو ہے، دل میں کدھر ہے؟ کیا عدالتوں میں اللہ کا دین نافذ ہے؟ بینکنگ سسٹم میں اللہ کا دین نافذ ہے؟ معیشت میں اللہ کے احکامات نافذ ہیں؟ ڈاکوؤں، چوروں، زانیوں کے لیے قرآنی سزائیں نافذ ہیں؟ زکوٰۃ اور عشر کے احکامات پر عمل درآمد ہو رہا ہے؟ ریاست کی ذمہ داری لوگوں کی کفالت کرنا ہے۔ سوشل ویلفیئر کا تصور، اکنامک جسٹس کا معاملہ کہاں ہے آج؟ یہ ہے آج ہماری ذلت اور رسوائی کی سب سے بڑی وجہ! ہمیں شرم آتی ہے اللہ کے رسول ﷺ کے روضے پر حاضری دیتے ہوئے۔ فلسطین والوں کے لیے دعائیں ہم نہیں کرتے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ! اُمت کا درد ختم ہو گیا۔

اے خاصہ خاصانِ رسلؐ وقت دعا ہے
اُمت پہ تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغریاء ہے!

مجھے معلوم ہے میں کڑوی بات کر رہا ہوں لیکن یہاں سے یہ احساس لے کر جانا ہے۔ اُمت کا درد لے کر جانا ہے۔ جنت البقیع میں کم و بیش دس ہزار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قبریں ہیں۔ ہم

سیرت کی کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر سوا لاکھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم موجود تھے۔ تو باقی صحابہ رضی اللہ عنہم کی قبریں کدھر ہیں؟ سب تو یہاں آسودہ خاک نہیں ہیں۔ وہ مدینہ چھوڑ کر کہاں چلے گئے؟ کوئی افریقہ کی طرف تو کوئی ترکیہ کی طرف گیا، کوئی پاکستان سے آگئے، کوئی آذربائیجان اور چین کی طرف گیا۔ یہ جملہ عجیب لگ رہا ہے کہ صحابہ مدینہ شریف چھوڑ کر چلے گئے۔ دراصل وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو لے کر ساری دنیا میں پھیلے، تب آپ اور میں مسلمان ہیں۔ آج یہ قرض میرے اور آپ کے ذمے ہے۔

تنہائی میں سوچیے گا، دل سے بات عرض کر رہا ہوں۔ ہم یہاں پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا اظہار کر رہے ہیں، سلام پیش کر رہے ہیں۔ اللہ سے دعائیں کر رہے ہیں کہ ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت عطا فرمادے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سامنا ہو تو جام کوثر میسر آئے۔ دل سے سوچیں اگر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سامنا ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے پوچھیں: تم لے کر کیا آئے ہو؟ یا کیا دے کر آئے ہو؟ میں نے اپنا خون طائف میں دیا تھا، اُحد کے میدان میں دیا تھا۔ میرے گھر میں دودو مہینے چلو ہائیں جلاتھا۔ میں نے اپنے صحابہ کی جانیں اللہ کی راہ میں پیش کی تھیں۔ تم کیا دے کر آئے ہو؟ خون تو بڑی بات ہے، کیا میرا اور آپ کا پسینا بھی اللہ کے دین کے لیے بہتا ہے؟ فاقہ تو بڑی بات ہے، ہم اپنے آپ کو کسی فنانشل لیول پر روک کر اسی پر گزارا کرنے کی کوشش کریں اور دین کے لیے کچھ لگانے کی فکر کریں۔

ہمارے استاد ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے بڑی سخت بات فرمائی کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میدانِ اُحد میں تھے، آپ کا خون اطہر بہ رہا تھا، صحابہ کی جانیں پیش ہو رہی تھیں، اگر اُس وقت کوئی شخص مسجد نبوی میں بیٹھا تلاوت کر رہا ہوتا، نوافل پڑھ رہا ہوتا، درود و سلام کے نذرانے پیش کر رہا ہوتا، تو کیا اس کا ایمان معتبر ہوتا؟ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم وہاں، تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ آج جب اللہ کا دین مغلوب ہے جس کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم غالب کر کے گئے تھے، اس دین کے مغلوب ہونے کا کیا ہمیں افسوس ہے؟ آج ہمارے اسمارٹ فون کی اسکرین ٹوٹ جائے تو ہمیں غصہ آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکامات ٹوٹے ہوئے ہیں، کیا ہم واقعتاً اُمتی کہلانے کے مستحق ہیں جبکہ اللہ کے دین کے مغلوب ہونے کا ہمیں کوئی افسوس نہیں؟ اللہ کے احکامات کے ٹوٹنے کا کوئی افسوس نہیں! ہماری گاڑی کا شیشہ ٹوٹ جائے تو افسوس ہوگا۔ ڈز سیٹ میں سے کوئی ایک چیز ٹوٹ

جائے تو ہمیں افسوس ہوگا۔ اللہ کا دین پامال ہے، دین کے احکامات ٹوٹ رہے ہیں لیکن ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ اس پوری کائنات میں سب سے زیادہ قیمتی جان اور سب سے زیادہ قیمتی خون اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ وہ جان اللہ کے دین کی دعوت کے کام میں لگی رہی۔ صرف انفرادی عبادات میں نہیں، اللہ کے دین کے قیام کی جدوجہد میں زندگی لگی۔ میری اور آپ کی جان تب قیمتی ہوگی جب اللہ کے دین کی دعوت کے کام میں میرا اور آپ کا وقت لگے گا۔ اسی کو علامہ اقبال نے کہا: ۛ

کی محمدؐ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں!

اس اُمت کے بہت سارے مسائل ہیں لیکن حل ایک ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُخْلِصْكُمْ مِمَّا فِي الْأَقْدَامِ﴾ (محمد)

”اے ایمان والو! اگر تم اللہ کی نصرت کرو گے (اس کے دین کی مدد کرو گے، اس کے

رسولؐ کے لئے ہوئے دین کی جدوجہد کرو گے) تو اللہ تمہاری مدد فرمائے گا اور

تمہارے قدموں کو جمادے گا۔“

اسی کے لیے ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا کہ اللہ کا دین غالب کر کے دنیا کے سامنے پیش کریں۔ اسی کو علامہ اقبال نے کہا تھا کہ دورِ ملوکیت میں اسلام کے روشن چہرے پر جو پردے پڑ گئے تھے، ہمیں اُن کو ہٹانے کا موقع میسر آئے گا۔ شریعت نافذ ہو جائے گی تو دنیا کے مسائل کا حل میسر آئے گا۔ اسی کو قائد اعظم نے کہا تھا کہ مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام نے انسانیت کو غلام بنا چھوڑا، اب ہمارا فرض ہے کہ خلافت راشدہ کا رول ماڈل دنیا کے سامنے رکھیں اور دورِ جدید کی اسلامی فلاحی ریاست کا نمونہ پیش کریں۔ یہ ہماری ویشن کی کلیئرٹی تھی جب ہم نے پاکستان حاصل کرنا چاہا تھا۔

آخر میں ایک حدیث پیش کرتا ہوں، جسے دل کے کانوں سے سنئے گا۔ ٹیلی ویشن کے ایک مشہور پروگرام میں ہم بھی شامل تھے۔ اینکر نے سوال کیا: کیا اچھا ہوتا اگر ہم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ہوتے؟ میں نے عرض کیا: بھائی یہ اللہ کا فیصلہ ہے۔ کب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آنا تھا، اللہ کا فیصلہ ہے۔ کب مجھے اور آپ کو دنیا میں آنا تھا، اللہ کا

فیصلہ ہے۔ اس میں آپ کا میرا کوئی اختیار نہیں۔ ہم ماضی میں واپس نہیں جاسکتے۔ البتہ آنے والے کل کے بارے میں آپ کو ایک حدیث سنائے دیتا ہوں۔ یہ بہت بڑا تحفہ ہے۔ مصنف ابن ابی شیبہ حدیث کی اولین دور کی کتب میں سے ہے۔ اس میں یہ روایت نقل کی گئی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مجمع تھا تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا:

((يَا لَيْتَنِي لَقِيتُ إِخْوَانِي))

”اے کاش! میری ملاقات میرے بھائیوں سے ہو جائے۔“

صحابہ نے عرض کیا:

يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَلَسْنَا إِخْوَانُكَ وَ أَصْحَابُكَ؟

”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا ہم آپ کے بھائی اور آپ کے ساتھی نہیں؟“

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((بَلَى، وَلَكِنْ قَوْمٌ يَحْيِيئُونَ مِنْ بَعْدِكُمْ))

”ہاں بالکل! لیکن میں ان لوگوں سے ملنا چاہتا ہوں جو تمہارے بعد آئیں گے۔“

اب تین باتیں آگئیں۔ فرمایا:

((يُؤْمِنُونَ بِإِيمَانِكُمْ، وَ يُصَدِّقُونِ تَصْدِيقَكُمْ، وَ يُنْصَرِفُونِ نَصْرَكُمْ))

”وہ مجھ پر ایمان لائیں گے جیسے تم ایمان لائے ہو، اور میری تصدیق کریں گے جیسے تم نے میری تصدیق کی ہے، اور میری مدد کریں گے جیسے تم نے میری مدد کی ہے۔“

((فَيَا لَيْتَنِي لَقِيتُ إِخْوَانِي))

”پس کاش! میری ملاقات میرے بھائیوں سے ہو جائے۔“

یہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش ہے۔ ہم چاہتے ہیں آپ سے ملیں۔ ہم چاہتے ہیں آپ کی شفاعت ملے، آپ کے ہاتھوں جام کوثر پینا ملے، جنت الفردوس میں آپ کا پڑوس ملے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے ملنا چاہتے ہیں! اللَّهُ أَكْبَرُ كَبِيرًا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خواہش کا اظہار کیا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کس کام میں ہماری نصرت درکار ہے؟ گھر کے لیے، جائیداد کے لیے، کاروبار کے لیے؟ قطعاً نہیں! وحی کا آغاز ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کاروبار ختم، تجارت ختم۔ اب دعوتِ دین اور نفاذِ دین کی جدوجہد شروع ہوئی۔ ۲۳ برس کا مشن ہمارے سامنے ہے۔ دعوتِ دین کے کام میں قرآن کو پھیلانے کے کام میں،

ماہنامہ میثاق (25) ستمبر 2026ء

اللہ کے دین کو قائم کرنے کے کام میں اللہ کے دین کی سر بلندی کی جدوجہد میں ہماری نصرت مطلوب ہے۔ وہ جو سورہ محمد (آیت ۷) میں فرمایا گیا کہ اگر تم اللہ (کے دین) کی نصرت پر لگو گے تو اللہ تمہاری نصرت کرے گا۔ یہ بھی ارشاد ہوا:

((قَالِ الَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ ۖ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ)) (الاعراف)

”پس جو اُس (رسول نبی اُمی صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لائیں گے، آپ کی تعظیم کریں گے، آپ کی حمایت و نصرت کریں گے اور اُس نور کی پیروی کریں گے جو آپ کے ساتھ نازل کیا جائے گا وہی فلاح پانے والے ہوں گے۔“

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت عطا فرمائے۔ دل سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ایمان عطا فرمائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب اور احترام نصیب فرمائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اتباع کی توفیق عطا فرمائے۔ جو مبارک کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ برس میں سرانجام دیا، مجھے اور آپ کو کرنے کی توفیق دے تو کل شرمندگی نہیں ہوگی، ذلت و رسوائی نہیں ہوگی۔ اگر ہم یہ کام نہیں کر رہے تو سوچنا چاہیے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا سامنا کیسے ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس دن کی ذلت و شرمندگی سے بچائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین!



شرک کی حقیقت، اقسام اور دور حاضر کے شرک سے واقفیت کے لیے مطالعہ کیجئے

حقیقت و اقسام شرک

ڈاکٹر اراحمد رحمۃ اللہ علیہ

اشاعت خاص 400 روپے، اشاعت عام 150 روپے

سُورَةُ الْبَقَرَةِ (۱۱)

مدّس: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

فرمایا: ﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ط﴾ ”اور یاد کرو جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔“

خلیفہ کا مفہوم

مفسرین نے لفظ ”خلیفہ“ کے لفظ پر بڑی بحث کی ہے۔ ویسے تو یہ خلف (پیچھے) سے ہے۔ اس اعتبار سے خلیفہ کا مفہوم ہے: پیچھے آنے والا جانشین۔ یعنی خلیفہ وہ ہوتا ہے جو کسی کے بعد اُس کے معاملات سرانجام دینے کے لیے اُس کی جگہ لے لیکن اس کا استعمال بالعموم اُس شخص کے لیے ہوتا ہے جس کو کسی کی طرف سے کسی وجہ سے نیابت دے دی جائے۔ چنانچہ کسی شخص یا کسی ہستی کا انتقال ہو جائے اور اُس کی جگہ پر اُس کا جانشین آجائے تو وہ اُس کا خلیفہ ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص کسی وجہ سے معزول ہو جائے اور اپنی زندگی ہی میں کسی کو اپنا خلیفہ نامزد کر دے۔ البتہ یہ بات مسلم ہے کہ زمین میں حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت، معاذ اللہ! اللہ تعالیٰ کے غائب ہونے کی وجہ سے نہیں ہے۔ وہ تو ہر جگہ ہر آن موجود ہے۔ وہ الحی القيوم ہے۔ وہ زندہ جاوید ہے اُس پر موت وارد ہونے والی نہیں ہے۔ پھر معاذ اللہ! اسے کوئی عجز یا کمزوری لاحق نہیں ہے۔ مزید برآں کسی ہستی کے مقام و مرتبہ کے اظہار کے لیے بھی لفظ خلیفہ استعمال ہوتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام اور ذُرِیَّتِ اٰدَمَ کے خلیفہ قرار دیے جانے کا اصل مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اگرچہ غائب نہیں ہے حاضر ہے: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ ط﴾ (الحدید: ۴) لیکن اُس

نے ایک پردہ غیب حائل کر دیا ہے جس کے اِس طرف اُس نے انسان کو خلافت عطا فرمائی ہے اُسے نیابت دی ہے اُسے اختیار دیا ہے کچھ autonomy دی ہے۔ یہ آدم و ذُرِیَّتِ اٰدَمَ کا مقام ہے یہ منصب اس کے ساتھ مخصوص ہے۔

اس ضمن میں دو بحثیں ہیں۔ ایک یہ کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ط﴾ تو اس سے کیا مراد ہے؟ آیا شخص آدم یا ذُرِیَّتِ اٰدَمَ؟ ایک رائے یہ ہے کہ ذُرِیَّتِ اٰدَمَ یا نسلِ آدم مراد ہے شخصِ آدم نہیں۔ اس لیے کہ یہاں آدم کا لفظ نہیں آیا۔ وہ آگے آئے گا: ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا﴾ یہاں پر مجرد خلیفہ کا لفظ آیا ہے۔ البتہ اکثریت کی رائے یہ ہے کہ یہاں پر خلیفہ سے ذاتی طور پر حضرت آدم علیہ السلام مراد ہیں۔ دوسری بحث یہ کہ خلافت کس معنی میں ہے؟ آج کل بھی بعض لوگ یہ رائے پیش کر رہے ہیں اور ہماری بزرگ شخصیات میں سے امام ابن تیمیہ اور اہل علم کے ایک حلقہ کی یہ رائے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خلافت کا کیا سوال! وہ تو ہر جگہ اور ہر آن موجود ہے۔ اُس کو تو (معاذ اللہ!) نہ موت آئی ہے اور نہ آئے گی۔ لہذا اللہ کا خلیفہ چہ معنی دارد؟ گویا اُن کے نزدیک حضرت آدم علیہ السلام یا ذُرِیَّتِ اٰدَمَ کے خلیفہ اللہ ہونے کا تصور ہی غلط ہے بلکہ وہ تو اسے شرک و کفر تک قرار دیتے ہیں۔

البتہ قرآن مجید کی تفسیر میں اس طرح کے معاملات میں ہمیں سلف کی طرف رجوع کرنا ہے اور ظاہر بات ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بڑھ کر ان چیزوں کا جاننے والا اور کوئی نہیں ہے۔ یہ کوئی مادی علوم نہیں ہیں بلکہ یہ وہ حقائق ہیں جو بذریعہ وحی ہی معلوم ہو سکتے ہیں جس کا منبع سرچشمہ ذاتِ محمدی ﷺ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست اور اولاً اکتساب کرنے والے صحابہ کرامؓ ہیں۔ اس معاملے میں صحابہ کرامؓ سے جو اقوال منقول ہوئے ہیں ان میں بھی دورائیں موجود ہیں۔ اکثریت کی رائے یہ ہے کہ یہاں ”خلیفہ“ سے مراد خلیفۃ اللہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔ اگرچہ یہاں صراحت نہیں ہے۔ الفاظ ہیں: ﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ط﴾ ”میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔“ یعنی میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ زمین میں

ایک خلیفہ بناؤں۔ ”جَاعِل“ اسم الفاعل ہے۔ اس میں ایک عزیمت، پختہ ارادہ اور فیصلہ کا مفہوم ہوتا ہے۔ اسی لیے میں نے الفاظ قرآنی کی ترجمانی بایں الفاظ کی ہے کہ ”میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ زمین میں ایک خلیفہ بناؤں۔“ لیکن یہ وضاحت نہیں ہے کہ اپنا خلیفہ بناؤں یا کسی اور کا خلیفہ!

جہاں تک اس مقام کے متن کا تعلق ہے تو دونوں امکانات موجود ہیں۔ چنانچہ ہمیں سلف میں بھی یہ دونوں اقوال ملتے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ زمین پر جنات پہلے سے موجود تھے، جن میں شر کا عنصر غالب ہے اور انہوں نے یہاں سرکشی مچائی۔ اس اعتبار سے کہا گیا کہ ان کو یہاں سے بے دخل کر کے ان کے بعد میں آنے والے آدم اور ذریت آدم کو یہاں بسایا گیا۔ تو گویا وہ جنات کے خلیفہ ہوئے۔ یہ ایک رائے ہے جو سلف میں بھی موجود ہے۔ البتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں دوسرا قول زیادہ مقبول ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ کا خلیفہ بنایا گیا۔ چنانچہ امام رازیؒ کہتے ہیں کہ مفسرین و اسلاف نے اس ضمن میں دو امکانات کا اظہار کیا ہے۔

الأول: بأنه تعالى لما نفى الجن من الأرض وأسكن آدم الأرض كان آدم عليه السلام خليفة لأولئك الجن الذين تقدموه. يروى ذلك عن ابن عباس.

”پہلا امکان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب جنات کو زمین سے بے دخل کیا اور حضرت آدم علیہ السلام کو یہاں آباد کیا تو حضرت آدم علیہ السلام گویا جنات کے خلیفہ ہوئے جو ان سے پہلے یہاں آباد تھے۔ یہ روایت کیا گیا ہے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے۔“

الثاني: إنما سماه الله خليفة لأنه يخلف الله في الحكم بين المكلفين من خلقه وهو المروي عن ابن مسعود وابن عباس والسدي وهذا الرأي متأكد بقوله: ﴿يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ﴾

”دوسرا احتمال و امکان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفہ کا نام اس لیے دیا ہے کہ وہ (زمین میں) اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کے مابین فیصلے کرنے میں اللہ

کے نائب کی حیثیت سے کام کریں گے۔ اور یہ دوسرا قول ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ اور سعدیؓ سے مروی ہے۔ یہ (مؤخر الذکر) رائے اللہ تعالیٰ کے اس قول کی رو سے مضبوط ہو جاتی ہے: ﴿يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ﴾ (ص) اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین کی خلافت عطا کی ہے پس تم لوگوں کے مابین حق کے ساتھ فیصلہ کرو۔“

یعنی عبد اللہ بن عباسؓ سے دونوں قول مروی ہو گئے۔ اس طریقے سے جو اقوال منسوب ہو جاتے ہیں ان میں امکان ہوتا ہے کہ ان کی پہلے کوئی ایک رائے ہو پھر انہوں نے اپنی رائے بدلی ہو۔ اُن کے کسی شاگرد کے علم میں وہی پہلی رائے ہو اور اُس نے وہی آگے منتقل کر دی ہو جبکہ کسی دوسرے شاگرد کے علم میں اُن کی دوسری رائے ہو اور اُس نے وہ رائے نقل کی ہو۔ اس اعتبار سے اس بارے میں کوئی تشویش کی ضرورت نہیں ہے کہ ایک ہی شخص کی طرف دو اقوال کیسے منسوب ہو گئے۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا اگرچہ علم تفسیر میں بہت اونچا مقام ہے لیکن وہ نوجوان صحابہؓ میں سے ہیں جب کہ عبد اللہ بن مسعودؓ کبار صحابہؓ (بزرگ صحابہؓ) میں سے ہیں اور انہوں نے یقین کے ساتھ کہا ہے کہ یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی خلافت ہے۔ امام رازیؒ اس بحث کو سمیٹتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ یہ دوسری رائے موکد ہے، اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی رو سے زیادہ قوی ہو جاتی ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام سے خطاب کر کے فرمایا گیا۔

اصل میں تو حکم دینا اللہ تعالیٰ کا اختیار ہے: ﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ﴾ (یوسف: ۴۰) لیکن نائب کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے یہ اختیار حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی ذریت کو دیا ہے، اسی لیے وہ خلیفۃ اللہ فی الارض ہیں۔ ہمارے ائمہ مفسرین میں سے ابن جریر، معالم، بحر بیضاوی، اور بڑی بڑی جو ائمہ التفاسیر ہیں سب کے اندر یہ رائے موجود ہے۔ تاہم ہمارے بزرگوں اور ائمہ میں سے چند ایک نے جن میں امام ابن تیمیہؒ بھی ہیں اس رائے سے اختلاف کیا ہے، لیکن اور بھی بہت سے معاملات میں ان کی شاذ آراء ہیں جن سے جمہور مفسرین اتفاق نہیں کرتے۔ ہر ذہین اور genius آدمی کی کوئی نہ کوئی ایسی بات

ہوتی ہے جس میں وہ دوسروں کے ساتھ موافقت نہیں کرتا، جسے ”شاذ رائے“ کہا جاتا ہے۔ البتہ اصل اہمیت اُسی رائے کی ہوتی ہے کہ جس پر اجماع ہو یا جس پر اکثر اہل علم نے اتفاق کر لیا ہو اور اسی کو قبول کیا جانا چاہیے۔

قرآن میں خلافتِ آدمؑ کے اشارات

اس ضمن میں قرآن مجید سے راہنمائی لی جائے تو کی قرآن میں چار ایسے اسلوب اختیار کیے گئے ہیں کہ ان کی روشنی میں یہ خلافت، اللہ تعالیٰ کی خلافت کے سوا کوئی اور خلافت نہیں بن سکتی۔ قرآن حکیم میں حضرت آدمؑ کا مقام اس اعتبار سے اجاگر ہو کر سامنے آتا ہے کہ تمام فرشتوں کو ان کے سامنے سجدہ کرایا گیا۔ تمام مخلوقات کا اصل مجود تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہے، لیکن تمام فرشتوں کو حضرت آدمؑ کے سامنے سجدہ ریز کرنا یہ ثابت کر رہا ہے کہ اللہ کے بعد مقام حضرت آدمؑ کا ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ یہ واقعہ اس قدر اہم ہے کہ قرآن حکیم میں سات مرتبہ اس کا تذکرہ کیا گیا۔ دو مقامات (الحجر: ۳۰، ص: ۷۳) پر تو یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ﴾۔ اس جملے میں تاکید کے سب اسلوب جمع کر دیے گئے ہیں۔ الْمَلَائِكَةُ میں بھی لام حصر کا ہے، یعنی تمام فرشتے۔ كُلُّهُمْ ان میں سے سب کے سب۔ أَجْمَعُونَ سب کے سب جمع ہو کر، یک بارگی، ایک جماعت کی صورت میں، انہوں نے حضرت آدمؑ کو سجدہ کیا۔ اسی لیے انسان اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ خود ذریتِ آدمؑ میں سے ہیں۔ یہاں آدمؑ کو ہم ایک نوع کی حیثیت سے لے رہے ہیں کہ اس کائنات کے اندر جملہ مخلوقات میں باقی سب سے اشرف اور افضل حضرت آدمؑ اور ذریتِ آدمؑ ہے۔

اسی طرح فرمایا: ﴿...لِمَا خَلَقْتُ بَيْدَكَ﴾ (ص: ۷۵) ”.... جس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے تخلیق کیا۔“ اللہ تعالیٰ کے ہمارے جیسے دو ہاتھ تو نہیں ہیں۔ چنانچہ یوں کہا جائے گا کہ اس سے مراد ہے کہ میں نے آدمؑ کو بڑے اہتمام سے بنایا ہے، لیکن میرے نزدیک اس کی صحیح ترین تعبیر یہ ہے کہ عالمِ امر اور عالمِ خلق دونوں اللہ تعالیٰ کی ذات کے قبضہ قدرت میں ہیں: ﴿أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ﴾ (الاعراف: ۵۴) اور یہ دونوں ماہنامہ میثاق (31) ستمبر 2026ء

عالمِ مخلوقات میں سے صرف آدمؑ میں آکر جمع ہو گئے ہیں۔ اس کی روح عالمِ امر سے ہے اور اس کا یہ جسدِ و ماڈی وجود عالمِ خلق سے ہے۔ اگر یہ دونوں عالم جمع ہوئے ہیں تو وہ صرف ایک مخلوق انسان ہے، ورنہ ملائکہ صرف عالمِ امر کی شے ہیں، اور جنات صرف عالمِ خلق کی شے ہیں، ان میں وہ روح نہیں پھونکی گئی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح کا پھونکا جانا ہی درحقیقت حضرت آدمؑ کے شرف اور مقام و مرتبہ کو واضح کرتا ہے، جیسا کہ سورۃ الحجر (آیت ۲۹) اور سورۃ ص (آیت ۷۲) دونوں جگہ ایک جیسے الفاظ آئے ہیں: ﴿فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ﴾ ”تو جب میں اس کو پوری طرح درست کر دوں اور اس میں اپنی (طرف سے) روح پھونک دوں تو اس کے سامنے گر پڑنا سجدہ کرتے ہوئے۔“ اس کے بعد دونوں مقامات پر یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ﴾

پھر یہ کہ آدمؑ و ذریتِ آدمؑ کی فضیلت بایں طور بیان فرمائی:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَخَلَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا﴾ (بنی اسرائیل)

”اور ہم نے بڑی عزت بخشی ہے اولادِ آدمؑ کو اور ہم اٹھائے پھرتے ہیں انہیں خشکی اور سمندر میں، اور ہم نے انہیں پاکیزہ چیزوں سے رزق عطا کیا، اور انہیں فضیلت دی اپنی بہت سی مخلوق پر، بہت بڑی فضیلت۔“

نوٹ کیجیے کہ سورۃ بنی اسرائیل کے ساتویں رکوع میں قصہ آدمؑ و ابلیس کے فوراً بعد یہ آیت آئی ہے کہ بنی آدمؑ کو ہم نے بڑا اعزاز بخشا، ان کی ہم نے بڑی تکریم کی ہے۔ مزید یہ کہ اگرچہ قرآن مجید میں تو یہ مضمون موجود نہیں ہے لیکن تو رات میں آیا ہے:

"So God created man in His own image."

(Genesis 1: 27)

جبکہ ایک حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں: ((خَلَقَ اللَّهُ آدَمَ عَلَى صُورَتِهِ)) (متفق علیہ) ”اللہ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر بنایا۔“ اس سے مراد یہ شکل و صورت اور یہ جسم ماہنامہ میثاق (32) ستمبر 2026ء

نہیں ہے، یہ خدو خال نہیں ہیں۔ اس کی تاویل یہی ہے کہ خلق اور امر دونوں کو جمع کر دیا گیا۔ درحقیقت اللہ کی ذات میں اختیار کے اعتبار سے جمع ہیں خلق بھی اور امر بھی اور انسان کے وجود میں آ کر یہ دونوں عالم جمع ہو گئے ہیں۔

پھر مدنی سورتوں میں سے سورۃ الاحزاب میں یہ منفرد انداز بیان آیا ہے:

﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا﴾ (٩٤)

”ہم نے اس امانت کو پیش کیا آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر، تو ان سب نے انکار کر دیا اس کو اٹھانے سے اور وہ اس سے ڈر گئے، اور انسان نے اسے اٹھا لیا۔ یقیناً وہ بڑا ظالم اور بڑا نادان تھا۔“

یہاں بھی استعاراتی انداز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کوئی امانت آسمانوں پر، زمین پر، پہاڑوں پر، ہر شے پر پیش کی لیکن سب اس بار امانت کو اٹھانے سے ڈر گئے، سب نے گھبرا کر انکار کیا، لیکن انسان نے اس بار کو اٹھا لیا۔ بقول حافظ شیرازی۔

آسمان بارِ امانت نتوانست کشید

قرعہ کار بنامِ من دیوانہ زند!

”آسمان اس امانت کا وزن نہ اٹھا سکا، بالآخر اسے اٹھانے کا قرعہ مجھ دیوانے (حضرت انسان) کے نام نکلا۔“

میرے نزدیک اللہ کی امانت سے مراد یہاں وہ ”روح“ ہے جو انسان کے حیوانی وجود میں اللہ تعالیٰ نے بطور خاص پھونک رکھی ہے ﴿وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي﴾۔ یہ انسان کے اکرام و اعزاز اور اس کے مسجود ملائک بننے کی اصل بنیاد ہے۔

تخلیقِ آدم اور تصور ارتقاء

میرا اپنا ذاتی رجحان تخلیقِ انسانی میں ارتقاء (evolution) کی طرف ہے اور اس پر کچھ گفتگو آیت ۲۸ کے ذیل میں ہو چکی ہے۔ واضح رہے کہ ارتقاء کے نظریات ہمارے اسلاف میں مولانا روم (۱۲۰۷-۱۲۷۳ء)، ابن مسکویہ (۹۳۲-۱۰۳۰ء) اور دیگر

ماہنامہ میثاق (33) ستمبر 2026ء

مفکرین اور حکماء نے پیش کیے تھے۔ تب ڈارون کے تو آباء و اجداد کا بھی کہیں وجود نہیں تھا، وہ تو کل کی شے ہیں۔ مولانا روم تو کہتے ہیں۔

ہفت صد و ہفتاد قالب دیدہ ام

ہم چو سبزہ بارہا روئیدہ ام!

یعنی میں سات سو اسی بیکر تو پہلے ہی بیت آیا ہوں۔ کبھی میں جمادات میں تھا، پھر نباتات میں، پھر حیوانات میں آیا۔ ارتقاء کے مراحل طے کرتے ہوئے کہیں سے کہیں پہنچا۔ مجھے کیا اندیشہ ہے کہ موت مجھ میں کچھ کی کر دے گی! میرے لیے موت کا کیا سوال! یہ بات تو مسلم ہے کہ ہمارے لیے موت کا تصور فنا ہو جانا نہیں ہے۔ اس اعتبار سے انسانی حیات کا کوئی اختتام (end) ہے ہی نہیں۔ اس لیے کہ اہل سنت کے نزدیک جنت اور دوزخ دونوں ابدی ہیں۔ چاہے ادھر گئے، چاہے ادھر گئے۔ [امام ابن تیمیہ اور ابن عربی کی شاذ رائے ہے کہ جہنم ابدی نہیں ہے، ایک وقت آئے گا کہ وہ ختم ہو جائے گی، جبکہ جنت ابدی ہے، ہمیشہ رہنے والی ہے۔]

قرآن مجید کا ایک مقام ایسا ہے جو اس تصور ارتقاء کی بھرپور تائید کرتا ہے۔ وہ مقام سورۃ الاعراف کی آیت ۱۱ ہے، جہاں جمع کے صیغہ سے بات شروع کی گئی ہے: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ﴾ ”ہم نے تمہیں پیدا کیا“ ﴿ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ﴾ ”پھر تمہاری تصویر کشی کی“ تمہارا نقشہ بنا دیا، تمہارے خدو خال بنا دیے، تمہاری صورت گری کی۔ ﴿ثُمَّ قَلَّبْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ﴾ ”پھر ہم نے کہا فرشتوں سے کہ جھک جاؤ آدم کے سامنے!“ یہاں یہ نہیں کہا کہ ہم نے آدم کو بنایا، اُس کی صورت گری اور پھر ہم نے فرشتوں سے کہا کہ جھک جاؤ آدم کے سامنے۔ یہاں جمع کے صیغہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نوع (Homo sapiens) پہلے وجود میں آئی، اور اس نوع میں سے ایک چنیدہ فرد (selected individual) حضرت آدم علیہ السلام کا انتخاب ہوا ہے، جس کے لیے اب واحد کا صیغہ آ رہا ہے: ﴿فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي﴾ ”پھر جب میں اُس کی پوری طرح نوک پلک سنوار دوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں.....“

ماہنامہ میثاق (34) ستمبر 2026ء

پوری نوع میں سے جس فرد واحد کو اللہ تعالیٰ نے چُنا ہے اور اُس کے اندر اپنی طرف سے روح کو پھونکا ہے اب وہ حضرت آدمؑ بن گیا ہے اب وہ نرِ Homo sapiens نہیں ہے۔

یہ بالکل ممکن ہے جیسے زمین پر کئی بڑی بڑی انواع (species) بالکل معدوم ہو گئیں۔ ڈائنوسارز وغیرہ کے بڑے بڑے متحجر اجسام (fossils) نکلتے ہیں لیکن اب ان کا کہیں وجود نہیں ہے۔ اسی طرح کچھ بعید نہیں کہ حضرت آدمؑ سے پہلے کی پوری کی پوری نوع ہی ختم ہو گئی ہو۔ اس کے بعد حضرت آدمؑ جو اُس وقت کی ارتقا یافتہ (evolved) نوع کے ایک فرد واحد تھے جن کو اللہ نے چُنا پھر ان میں روح پھونکی انہی سے پوری نسلِ آدمؑ وجود میں آئی۔ اس میں قطعاً کوئی شے مستبعد اور خارج از امکان نہیں نہ عقلی اعتبار سے نہ سائنسی اعتبار سے اور نہ قرآنی اعتبار سے۔ قرآن مجید میں اس کے شواہد موجود ہیں۔ سورہ آل عمران میں ارشاد ہوا:

﴿إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَالْإِسْمَاعِيلَ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝﴾

”یقیناً اللہ نے چُن لیا آدمؑ کو نُوحؑ کو آلِ ابراہیمؑ کو اور آلِ عمران کو تمام جہان والوں پر۔“

ان الفاظِ قرآنی کی رو سے حضرت آدمؑ کو بھی اللہ نے چُنا ہے۔ ظاہر ہے ایک فرد کو کسی مجموعے کے اندر سے چُنا جاتا ہے۔ کوئی گلاب کا پودا ہے اُس میں دس پھول لگے ہوئے ہیں کسی کا دستِ حنائی اُن میں سے ایک پھول کو چُن لیتا ہے تو یہ اُس پھول کی قسمت ہے۔ یہ ہے ”اصطفاء“ یعنی پسند کر لینا، چن لینا۔ چنانچہ اس آیت میں لفظ ”اصطفاء“ کا حضرت آدمؑ پر اطلاق ہوا ہے۔ غور کیجیے اگر اللہ تعالیٰ نے آلِ ابراہیمؑ کو چُنا ہے تو پوری نوعِ انسانی میں سے چُنا ہے۔ کتنی ہی نسلیں تھیں جن میں سے آلِ ابراہیمؑ چنے گئے۔ عین ممکن ہے اسی طریقے سے حضرت آدمؑ کو چُنا گیا ہو۔ یہ نظریات امکان کے درجے میں رکھ رہا ہوں، لیکن ایسا نہیں ہے کہ یہ تصورات قرآن کے بیان کے ساتھ ہم آہنگ (compatible) نہ ہوں یا اس سے موافقت (reconcile) نہ کر سکتے ہوں۔ باقی ماہنامہ میثاق (35) ستمبر 2026ء

کسی کا تصور یہ ہو کہ زمین سے مٹی آسمان پر لے جائی گئی پھر مجسمہ بنا کر اس میں پھونک ماری گئی وہاں سے پھر اُن کو نیچے اتارا گیا تو قرآن مجید کی رو سے اس کا بھی امکان موجود ہے۔ یہ درحقیقت قرآن مجید کے اعجاز کا بہت اہم پہلو ہے کہ اصل بات ایک عام آدمی کی ذہنی سطح پر بھی پہنچ جاتی ہے اور اعلیٰ علمی و عقلی سطح پر بھی۔ اصل بات جو ہر ایک کو سمجھانی مقصود ہے وہ یہ کہ تمہارا خالق اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہے۔ اُس نے تمہیں بنایا، وہ تمہارا مالک ہے اور تمہیں اُسی کے پاس واپس بھی جانا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔ باقی یہ کہ کیسے بنایا، کن مراحل اور مدارج میں بنایا، کس شے سے بنایا، اس بارے میں غور و فکر کا میدان کھلا چھوڑ دیا۔ قرآن کی وسعتِ معانی کا اندازہ لگائیے کہ انسان کے مادہ تخلیق کے لیے صرف ”تُراب“ نہیں کہا، بلکہ مختلف مقامات پر پانچ مختلف تعبیرات اختیار کی گئیں۔ آخر اس میں کوئی حکمت ہے، اہل علم کے لیے اشارے ہیں۔ اسی میں وہ بات مضمر ہے کہ جب تمہارا علم بڑھے گا، تم ان چیزوں کو سمجھو گے تب تم پر یہ حقیقت اور مبرہن ہو جائے گی:

﴿سَدْرُہُمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاَفَاقِ وَفِیْ اَنْفُسِہُمْ حَتّٰی یَتَذٰکَّرُوْا اِنَّہُمْ لَیْحٰقِقُوْنَ ۝﴾

(خم السجدة: ۵۳)

”عنقریب ہم انہیں دکھائیں گے اپنی نشانیاں آفاق میں بھی اور ان کی اپنی جانوں کے اندر بھی، یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے گا کہ یہ (قرآن) حق ہے۔“

ہم انہیں آسمانوں اور زمین میں اور خود ان کی اپنی نشانیاں دکھائیں گے، یہاں تک کہ حقیقت ان پر پوری طرح منکشف ہو جائے گی، ان پر یہ بات مبرہن ہو جائے گی کہ یہ قرآن سرتا سر حق ہے۔ اس میں جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتایا ہے وہ سب کا سب صحیح اور درست ہے۔ اس اعتبار سے ہم ابھی اس رکوع کی پہلی آیت (۳۰) کے ایک ٹکڑے کا مطالعہ ہی کر سکے ہیں۔ بہر حال اس رکوع کے تہیدی مضامین کسی حد تک بیان ہو گئے ہیں۔

فرشتوں کا اشکال اور اس کا مسکت جواب

﴿قَالُوْۤا اَتَجْعَلُ فِیْہَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْہَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ﴾ ”انہوں نے کہا: (اے پروردگار!) کیا آپ بنائیں گے اس (زمین) میں (خلیفہ) اُس کو جو اس ماہنامہ میثاق (36) ستمبر 2026ء

میں فساد مچائے گا اور خون ریزی کرے گا؟“

اس ضمن میں ایک سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ فرشتوں کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ آدم یا اُس کی ذریت زمین میں فساد کرے گی؟ اس کا سیدھا سا بالکل تشفی بخش جواب یہ ہے کہ لفظ غلیفہ میں یہ شے مضمر ہے کہ اُسے خود ارادی اور خود مختاری (autonomy) دی جائے گی اور جہاں اختیار ہو وہاں اُس کے صحیح استعمال ہونے کے امکان کے ساتھ غلط استعمال ہونے کا امکان بھی موجود رہتا ہے (Authority tends to corrupt...)۔ فرشتے تو وہی کرتے ہیں جس کا انہیں حکم ملتا ہے، اس لیے کہ ان کے پاس کوئی اختیار نہیں۔ اہل سنت کا مجمع علیہ عقیدہ یہی ہے۔ لہذا فساد کا کوئی سوال نہیں۔ پھر یہ کہ اس سے قبل زمین پر جنات بھی آباد رہے اور ان کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایک اختیار اور ارادہ رکھا تھا۔ ان کا مکلف وجود ہے جس میں خیر اور شر دونوں کا امکان ہے۔ انہوں نے یہاں پر خون ریزی کی اور فساد بھی مچایا، تو انہی پر قیاس کرتے ہوئے فرشتوں نے کہا کہ اگر آدم کو خلافت دی جائے گی اور اسے اختیار دیا جائے گا تو یہ زمین میں فساد مچائے گا اور خون ریزی بھی کرے گا۔

﴿وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ﴾ ”جبکہ ہم آپ کی حمد و ثنا کے

ساتھ تسبیح میں لگے ہوئے ہیں اور آپ کی تقدیس کر رہے ہیں۔“

وادیہاں حالیہ ہے بمعنی جبکہ در آنحالیکہ۔ فرشتوں نے عرض کی: پروردگار! زمین میں کسی کو خلیفہ بنانے کی کیا ضرورت ہے، در آنحالیکہ ہم آپ کی تسبیح میں لگے ہوئے ہیں حمد کے ساتھ اور آپ کی تقدیس کر رہے ہیں۔ یہاں دو الفاظ جمع ہو کر آئے ہیں: تسبیح اور تقدیس۔ ان دونوں کا مشترک ترجمہ تو پاکی بولنا، پاکی بیان کرنا کیا جاتا ہے، لیکن دونوں کو الگ الگ سمجھ لیجیے۔ تسبیح کا مادہ ”س ب ح“ ہے۔ سَبَّحَ یُسَبِّحُ (فعل لازم) کے معنی ہیں تیرنا۔ اگر کوئی شے پانی میں تیزی کے ساتھ حرکت کر رہی ہو تو ڈوبے گی نہیں، اپنی سطح پر برقرار رہے گی۔ اسی طرح اگر وہ خلا میں تیزی سے حرکت کر رہی ہے تو اپنے مدار میں اپنی

سطح پر برقرار رہے گی۔ چنانچہ اس کے مفہوم میں تیزی اور گرم جوشی کے ساتھ ایک حرکت ہے۔ ”سبح“ سے باب تفعیل میں سَبَّحَ یُسَبِّحُ آتا ہے، یعنی کسی شے کو تیرانا۔ کسی شے کو اُس کی اصل جگہ پر اُس کی سطح پر برقرار رکھنا۔ یہ اس کا لغوی مفہوم ہے۔ اللہ کی تسبیح کے کیا معنی ہیں؟ یہ کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا جو مقام بلند ہے، اسے اس پر برقرار رکھا جائے۔ کوئی ایسا تصور اُس کی ذات یا صفات کے ساتھ شامل نہ ہو جائے جو اُس کے شایان شان نہ ہو اور اس کے مقام سے فروتر ہو۔ اللہ تعالیٰ کو اُس کے اصل مقام رفیع پر برقرار رکھنا اللہ کی تسبیح ہے۔ یعنی اس بات کا اقرار کرنا کہ اللہ تعالیٰ ہر احتیاج سے، ہر عیب سے، ہر نقص سے، ہر کوتاہی سے اعلیٰ، ارفع، منزہ اور مبترا ہے۔ یہ تسبیح ہے۔ اس لفظ (سَبَّحَ) کے اندر جو سرگرمی ہونا کا مفہوم شامل ہے اس کے اعتبار سے کسی کے حکم کی بجا آوری میں اس درجے سرگرمی دکھانا کہ اُس کا ہر حکم واجب الاطاعت ہو جائے۔ تسبیح کا اصل مفہوم یہ ہے جو اسے تقدیس سے علیحدہ کرتا ہے۔ تقدیس کا مفہوم کسی ہستی کی بڑائی، بزرگی، اُس کے ہر عیب و نقص سے پاک ہونے کا اعتقاد رکھتے ہوئے زبان سے اس کا اقرار کرنا ہے۔ اس میں اعتقاد اور فکری عنصر زیادہ ہے۔ تسبیح اپنے عمل اور اپنے رویے سے کسی کی بزرگی، اُس کی عظمت، اُس کے اختیار، اُس کے اقتدار کو تسلیم کرنا اور اُس کے سامنے اپنے آپ کو جھکائے ہوئے رہنا ہے۔ فرشتوں کا یہ اقرار تھا کہ ہم آپ کی تمام مشیتوں، تمام ارادوں، اور تمام فرامین و احکام کو سرگرمی کے ساتھ بجالا رہے ہیں، حمد کے ساتھ، شکر کے ساتھ۔ گویا ہم شکر ادا کر رہے ہیں کہ آپ کے حکم کو بجالانے کا موقع ملا۔

مَنْتَ مَنْهْ کہ خدمت سلطان بھی کئی

مَنْتَ شَناس ازو کہ بخدمت بداشت!

(بادشاہ پر احسان نہ رکھو کہ تم اُس کی خدمت بجالا رہے ہو، بلکہ اُس کا احسان مانو)

کہ اُس نے تمہیں خدمت کے لیے قبول کر لیا ہے۔)

ہم آپ کا شکر ادا کرتے ہوئے، آپ کا احسان مانتے ہوئے، آپ کی حمد کے ترانے الاپتے ہوئے، آپ کے احکامات کی بجا آوری میں پوری طرح سرگرم ہیں اور آپ کی تسبیح

وتقدیس کا حق ادا کر رہے ہیں۔ ہمیں تو اس ضرورت کا کوئی احساس نہیں ہو رہا جس کی وجہ سے آدم کو خلافت دی جائے اس کو خلیفہ معین اور مقرر کیا جائے۔

﴿قَالَ إِنِّيْ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ ”(اللہ تعالیٰ نے) فرمایا: میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔“ (جاری ہے)

بارک اللہ لی ولکم فی القرآن العظیم، ونفعنی وایاکم بالآیات والذکر الحکیم



تواصی بالصبر

ڈاکٹر اسرار احمد

خطبہ مسنونہ کے بعد:

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

﴿وَالْعَصْرِ ۝۱ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝۲ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۝۳ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝۴﴾ (العصر)

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ اِنِّىْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝۵﴾ وَلَا تَسْتَوِ الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ اِذْفَعْ بِالَّذِيْ هِيَ اَحْسَنُ

فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝۶ وَمَا يُلْقِهَا اِلَّا

الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلْقِهَا اِلَّا دُوْحَظٌ عَظِيْمٌ ۝۷﴾ (لحم السجدة)

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۸﴾ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۚ بَلْ اَحْيَاءٌ

وَلٰكِنْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝۹ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ

مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۚ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝۱۰﴾ (البقرة)

صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ

رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ۝ وَيَسِّرْ لِيْ اَمْرِيْ ۝ وَ اَخْلِلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ۝

يَفْقَهُوا قَوْلِيْ ۝ اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَاَرْزُقْنَا اِتِّبَاعَهُ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَاَرْزُقْنَا اجْتِنَابَهُ، اَللّٰهُمَّ اَلْهِنَّا رُشْدَنَا وَاَعِزَّنَا مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا، رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ تَوْفَقًا مُّسْلِمِيْنَ — اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنْ عِبَادِكَ الَّذِيْنَ

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ

واضح رہے کہ ”درس قرآن“ کا یہ سلسلہ ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے قرآن آڈیو ریم لاہور میں ہونے والے مفصل دروس قرآن پر مشتمل ہے جو ۱۹۹۱ء میں شروع ہوئے۔ بعض قارئین کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ ”بیان القرآن“ کی قسط وراشتاعت ”میثاق“ میں دوبارہ شروع کر دی گئی ہے۔ ”بیان القرآن“ کی اشاعت فروری ۲۰۲۵ء کے شمارے میں پایہ تکمیل کو پہنچ گئی تھی اور اس سے اگلے شمارے (مارچ ۲۰۲۵ء) سے ان صفحات میں ڈاکٹر صاحب کے مفصل دروس قرآن کی سلسلہ وراشتاعت کا آغاز کر دیا گیا تھا۔ اسی شمارے کے ص ۲۸ پر ان مفصل دروس قرآن کی تاریخ بھی بیان کر دی گئی تھی۔ پیش نظر ”درس قرآن“ کی ترتیب و تدوین نہایت عرق ریزی سے کی جا رہی ہے اور یہ ذمہ داری مدیر شعبہ مطبوعات حافظ خالد محمود و خضر سرانجام دے رہے ہیں۔ (ادارہ)

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر ”بیان القرآن“ کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ)

صبر کی اہمیت اور مفہوم

آج کی گفتگو سورۃ العصر میں بیان کردہ کامیابی و نجات کی چار شرائط میں سے آخری شرط ”تواصی بالصبر“ سے متعلق ہے۔ سب سے پہلے صبر کا مفہوم سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اس سے کیا مراد ہے! اس کے مراتب و مراحل کیا ہیں؟ دین میں کس کس اعتبار سے صبر کی تلقین کی گئی ہے اور کتنا صبر درکار ہے؟

ہمارے دین میں ہر مقام پر چوٹی کی چیز صبر ہے۔ سورۃ العصر میں بھی آخری بات صبر ہے:

﴿إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۝ وَتَوَاصَوْا

بِالصَّبْرِ ۝﴾

سورۃ المدثر کی ابتدائی سات آیات میں حضور ﷺ کو خصوصی خطاب ہوا اس میں بھی آخری بات صبر بیان ہوئی:

﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَأَنذِرْ ۝ وَرَبِّكَ فَكَذَّبْ ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝﴾

سورۃ المزمل میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو صبر کی خصوصی تلقین فرمائی:

﴿وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا ۝﴾

سورۃ الحکم السجدة میں مقام دعوت کا ذکر ہے اور اس اعتبار سے بھی جس اہم ترین چیز کا ذکر آیا وہ صبر ہے:

﴿وَمَا يُلْقِيهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا ۚ وَمَا يُلْقِيهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ۝﴾

سورۃ البقرہ کی مشہور آیات جن کی تلاوت آغاز میں کی گئی ان میں بھی فرمایا گیا:

﴿وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ ۚ﴾ ساتھ ہی ارشاد ہوا: ﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝﴾۔

پھر فرمایا گیا: ﴿وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۝﴾ — ان آیات مبارکہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ

ہمارے دین میں صبر کا کیا مقام ہے!

صبر کا مفہوم ہے اپنے آپ کو روکنا، تھمنا، برداشت کرنا، تحمل کرنا۔ اپنے طے شدہ

ماہنامہ میثاق (41) ستمبر 2026ء

مقصد کے حصول کے لیے کسی بھی مخالفت سے بد دل ہوئے بغیر پیش قدمی کرتے رہنا۔ گویا کوئی تکلیف و مخالفت ہر اسان نہ کر سکے اور نہ ہی کوئی لالچ منحرف کر سکے۔ ان دونوں چیزوں سے کوئی تاثر لیے بغیر جو راستہ طے کیا ہے اُدھر ہی چلتے رہنا۔ دراصل دنیا میں کسی شخص کو اس کے راستے سے ہٹانے کے لیے دو حربے استعمال کیے جاتے ہیں: تشدد و تکلیف، ایذا یا پھر لالچ، کسی قسم کی رشوت۔ ان دونوں چیزوں کا کوئی اثر قبول کیے بغیر انسان کا اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے پوری ثابت قدمی، استقلال اور پامردی کے ساتھ پیش قدمی کیے چلے جانا صبر ہے۔

صبر سے پہلے تَوَاصَوْا اور تَوَاصَى کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ تَوَاصَوْا فعل ماضی ہے جبکہ تَوَاصَى مصدر ہے۔ جیسے ”آنا“ مصدر ہے، ”آیا“ فعل ہے، ”آئے گا“ فعل مستقبل، ”آتا ہے“ فعل حال ہے۔ چنانچہ تَوَاصَوْا باب تفاعل میں فعل ماضی (جمع مذکر) ہے اور تَوَاصَى اس کا مصدر ہے۔ باب تفاعل کی خاصیات کی وجہ سے دو معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک مبالغہ یعنی زور شور کے ساتھ، شد و مد کے ساتھ بڑے اہتمام سے، پوری قوت کے ساتھ صبر کی تلقین کرنا تو اِصَاصی بالصبر ہے۔ دوسرا مفہوم اشتراک کا ہے یعنی آپس میں ایک دوسرے کو وصیت کرنا۔ آپ مجھے صبر کی تلقین کریں میں آپ کو صبر کی تلقین کروں۔ اس سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ دین کا کام کرنے کے لیے جماعت ضروری ہے جس میں ایک دوسرے کو وصیت کی جارہی ہو کیونکہ یہ انسانی کمزوری ہے کہ کبھی کسی کا جذبہ بہت قوی ہوتا ہے لیکن کبھی پڑ مر دگی بھی طاری ہو جاتی ہے۔ اگر آپ کسی جماعت میں شامل ہیں تو کوئی ساتھی آپ کی ہمت بندھا دے گا لیکن اگر ایک فرد ڈھیلا پڑ جائے تو شیطان کے حملہ کی وجہ سے وہ پیچھے ہی جاتا رہتا ہے۔

جماعتی زندگی کی مثال ایسی ہے کہ اگر سیلاب کا کوئی تیز دھارا آ رہا ہو تو آدمی اکیلے نہیں کھڑا رہ سکتا، پانی اسے بہا لے جائے گا۔ البتہ اگر پندرہ بیس آدمی ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ایک دوسرے کے ساتھ جڑ جائیں تو کھڑے رہنے کی اُمید ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((يَدُ اللَّهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ)) ”اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے۔“ اور

ماہنامہ میثاق (42) ستمبر 2026ء

((يُذِ اللّٰهُ مَعَ الْجَمَاعَةِ)) [سنن الترمذی] ”اللہ کا ہاتھ (یعنی اُس کی مدد و نصرت اور تائید) جماعت کے ساتھ ہے۔“ ایک دوسری حدیث میں فرمایا: ((عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ)) [سنن الترمذی] ”تم پر لازم ہے کہ جماعت کی شکل اختیار کرو۔“ اسی طرح فرمایا: ((أَمُرُكُمْ بِخَمْسٍ، اللّٰهُ أَمَرَنِي بِهِنَّ: بِالْجَمَاعَةِ، وَ السَّمْعِ، وَ الطَّاعَةِ، وَ الْحُجْرَةِ، وَ الْجِهَادِ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ)) [مسند احمد] ”میں تمہیں پانچ چیزوں کا حکم دیتا ہوں، مجھے اللہ نے ان کا حکم دیا ہے: جماعت کا (امیر کی بات) سننے اور ماننے کا، اللہ کی راہ میں ہجرت اور جہاد کا۔“ اللہ کے دین کو غالب کرنے کی جدوجہد جو ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے اس کے لیے ان پانچ باتوں کو اختیار کرنا ضروری ہے۔ اس حوالہ سے آج یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہم انگریز یا فرانسیسیوں کے غلام ہیں، ہمارا اختیار نہیں۔ اب تو وہ دور ختم ہو گیا، اکثر و بیشتر اسلامی ممالک آزاد ہیں اس لیے اب ہم اللہ کے ہاں اس حوالہ سے بہت زیادہ جواب دہ ہیں۔

سورة العصر میں تَوَاصَوْا کے لفظ سے دو مفہوم سامنے آتے ہیں۔ انتہائی تاکید اور مبالغہ کے ساتھ کسی کام کو کرنا یعنی پوری امکانی استطاعت کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک دوسرے کو صبر کی تاکید و تلقین کرنا، ایک دوسرے کی ہمت بندھانا اور ایک دوسرے کے لیے سہارا بننا جو کہ جماعتی زندگی کا خاصہ ہے۔ گویا سورة العصر کے مطابق مسلمانوں کو اس راستہ پر چلنے کے لیے اجتماعی زندگی کی ضرورت ہے۔ صبر کے مختلف مراحل کو سمجھنے کے لیے سہ منزلہ عمارت کا نقشہ ذہن نشین ہونا چاہیے۔ دراصل یہ ایک فریم آف ریفرنس ہے جس کے حوالہ سے جہاد کی طرح صبر کے مراحل بھی سمجھ میں آسکیں گے۔

دینی فرائض کی منازل اور ان کے تقاضے

دینی فرائض کی پہلی منزل خود اللہ کا بندہ بننا ہے یعنی اسلام، اطاعت، تقویٰ اور عبادت۔ پوری زندگی میں ہمہ تن، ہمہ جہت اور ہمہ وقت اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر حکم کی کُلّی اطاعت کی جائے، جزوی نہیں۔ پوری طرح سرنڈر کرنا، سر تسلیم خم کرنا۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً﴾

(البقرة: ۲۰۸) ”اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ“ جو شخص دوسری منزل کی طرف جانا چاہتا ہے تو اُسے اولاً پہلی منزل کا اہتمام کرنا ہوگا۔ دوسروں کو نیکی کی تلقین کرنے سے پہلے اپنا دامن جھانکنا ضروری ہے۔ اس منزل کے تین جہاد ہیں:

(۱) اپنے نفس سے (۲) شیطان سے (۳) بگڑے ہوئے معاشرے سے

اس منزل پر دو طرح کے صبر ہوں گے:

(۱) صبر علی الطاعة (۲) صبر عن المعصية

صبر علی الطاعة یعنی اطاعت پر صبر کرنا، جم جانا۔ ناگوار کیفیات کو برداشت کرتے ہوئے انسان اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کرتا رہے جیسے موسم سرما میں فجر کی نماز کے لیے ٹھنڈے پانی سے وضو کرنا بغیر صبر کے ممکن نہیں۔ اسی کیفیت کا منافی رُخ صبر عن المعصية ہے، یعنی اپنے آپ کو اللہ کی نافرمانی کے ہر کام سے روکنا اور صبر کرنا۔ ناجائز کام کرنے کے بدلہ رشوت پیش کی جائے تو ظاہر ہے نفس اس طرف ترغیب دے گا لیکن اُس وقت اپنے آپ کو روکنا اور صبر کرنا ہوگا۔ فجر کی اذان کی آواز آجائے تو نفس کے تقاضوں کو پیچھے ڈال کر نماز کی ادائیگی کرنا ہوگی۔ ہر وہ چیز جو نفس کو مرغوب لیکن اللہ کے حکم کے خلاف ہو اس سے نفس کو روکنا اور تھامنا صبر عن المعصية ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو جب امرأة العزیز نے گناہ کی دعوت دی تو انہوں نے اپنے آپ کو اس سے روکا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبات میں اپنے آپ کو بھی مخاطب فرماتے: ((أَوْصِيكُمْ وَ نَفْسِي بِتَقْوَى اللّٰهِ)) ”لوگو! میں تمہیں اور اپنے نفس کو اللہ کے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں۔“ بہر حال پہلی منزل کے یہ دو صبر ہیں۔ صبر علی الطاعة مثبت طور پر ہے اور صبر عن المعصية منفی صبر ہے۔ دوسری منزل دعوت و تبلیغ کی ہے۔ سورة النحل میں دعوت کی تین سطحیں بتائی گئی ہیں:

﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ﴾ (آیت ۱۲۵)

”(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم!) دعوت دیجیے اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ اور ان سے مناظرہ کیجیے جو بہت اچھے طریقہ سے ہو۔“

معاشرہ کی ذہین اقلیت کو دلائل و براہین کے ساتھ اللہ کے راستہ کی طرف بلانا ہو، عوام الناس کو دل پر اثر کرنے والی کوئی بات پہنچانی ہو یا غیر مسلم مبلغین سے مناظرہ و مجادلہ کا مرحلہ ہو ان تینوں سطحوں پر ایسے لوگ ہونے چاہئیں جو مذکورہ میدانوں میں سپیشلائز کرنے کے لیے سامنے آئیں اور اس کام کے لیے اپنے آپ کو کُل وقتی طور پر وقف کر دیں۔ اس منزل پر صبر خصوصاً اپنے career کا ہوگا۔ ایک شخص میں اگر ذہانت ہے تو وہ کسی نفع بخش پیشے سے منسلک ہوگا، مثلاً ڈاکٹر یا انجینئر ہوگا۔ اُسے بڑی معقول تنخواہ مل رہی ہوگی۔ اب اگر ایسا شخص اپنی زندگی کا رُخ موڑ کر اپنی صلاحیت دین کی دعوت و تبلیغ کی طرف لگائے تو ظاہری بات ہے کہ اس کے کریئر کا نقصان ہوگا۔ اس کی آمدنی میں کمی آئے گی۔ اسے اپنے ذاتی مفادات اور شاندار مستقبل کے حوالہ سے قربانی دینی پڑے گی۔ اس کے لیے بہت صبر درکار ہے۔

اس حوالہ سے قادیانی نو جوانوں کی مثال ہے جو تبلیغ کے لیے تربیت حاصل کرتے ہیں اور اپنی زندگی اس کام میں وقف کر دیتے ہیں۔ اسی طرح پاکستان میں عیسائیت تیزی سے پھیل رہی ہے کیونکہ اس کے پادری جو سرد ترین ممالک کے رہنے والے ہیں، وہ گرم ترین ممالک میں آکر کام کر رہے ہیں۔ ہمارے لیے یہ بہت سوچنے کا مقام ہے کہ آج ہم میں سے کتنے لوگ اپنے بچوں کو دین کے لیے وقف کرنے کے لیے تیار ہیں! ہمارے ہاں جو صاحب حیثیت لوگ ہیں وہ تو اس طرف آنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے۔ ان سے اس بارے میں بات کی جائے تو کہہ دیتے ہیں: بھائی چندہ لے لو! بس کافی ہے، ہم اپنی اولاد کو اس کام کے لیے نہیں دے سکتے۔ یہ ہمارا حال ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج دنیا میں دین حق پامال ہے۔ صبر کے بغیر اس کام کے لیے لوگ تیار نہیں ہو سکتے۔ ہر ذہن آدمی اپنے وقت اور صلاحیت کو دنیا میں لگا کر پیسہ کما سکتا ہے لیکن اگر وہ اپنی ذہانت معاشرہ میں اعلیٰ علمی سطح پر دین کی دعوت دینے کے لیے لگائے تو یہ چیز دنیا میں کسی کمائی کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ گویا دین کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اپنے معاش کی قربانی تو دینی پڑے گی۔ اپنی ذہانت کو اس طرف لگانے سے دنیاوی کمائی میں جو کمی

آ رہی ہے اس کو جھیلنا اور خوش دلی سے برداشت کرنا صبر ہے۔

دعوت حق میں تمسخر و استہزاء: صبر کا امتحان

اس منزل پر صبر کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب بھی دعوت حق پیش کی جاتی ہے تو سب سے پہلے استہزاء اور تمسخر کا سامنا ضرور کرنا پڑتا ہے۔ اس حوالہ سے اُسوۂ محمدی ﷺ ہمارے سامنے ہے۔ مکہ والے آپ ﷺ کو صادق و امین کہتے تھے۔ آپ ان کی محبوب شخصیت تھے لیکن جب اسلام کی دعوت کا آغاز ہوا تو ان ہی لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی شان میں (معاذ اللہ!) مجنون، ساحر، شاعر، پاگل، کذاب، کاہن، جادوگر جیسے الفاظ استعمال کیے۔ تصور کیجیے کہ آپ ﷺ کسی جمع میں تشریف لے جا رہے ہیں اور اطراف سے اس قسم کے فقرے آتے ہیں تو یقیناً آپ ﷺ کے قلب مبارک کو تکلیف پہنچتی تھی۔ سورۃ الحجر میں یہ بات آئی:

﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ ۝۹۵﴾

”(اے نبی ﷺ!) ہمیں خوب معلوم ہے کہ جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں، اس سے آپ کے سینہ میں گھٹن ہوتی ہے۔“

یعنی ان کڑوی کیسی باتوں، استہزاء و تمسخر سے آپ کو جو گھٹن اور صدمہ کی کیفیت ہوتی ہے، وہ اللہ جانتا ہے۔ وہ لوگ کبھی قرآن کا مذاق اڑا رہے ہیں کہ فلاں آیت میری ہے فلاں تم لے جانا۔ کبھی اس آیت کا مذاق اڑایا جا رہا ہے کہ جہنم پر انیس فرشتے مقرر ہیں تو کسی نے کہا کہ دس کو تو میں اکیلے سنبھال لوں گا، باقی نو سے تم سب نمٹ لینا۔ بہر حال حضور ﷺ کے کانوں میں یہ باتیں جاری تھیں، جس کی وجہ سے دل شدید صدمہ میں تھا۔ اسی لیے سورۃ القلم میں آپ ﷺ کو ان الفاظ میں تسلی دی جا رہی ہے:

﴿ن وَالْقَلَمِ ۖ وَمَا يَسْطُرُونَ ۝۱ مَا أَنْتَ بِمُجْنُونٍ ۝۲ وَإِنَّ لَكَ

لَا جَرَ آغْيَٰرَ مَهْمُونٍ ۝۳ وَإِنَّكَ لَعَلَّ خُلُقٍ عَظِيمٍ ۝۴﴾

”قسم ہے قلم کی اور جو لکھتے ہیں۔ آپ اپنے رب کے فضل سے (ہرگز) مجنون نہیں۔ اور بے شک آپ کے لیے یقیناً نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔ اور بے شک

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) بہت اونچے اخلاق پر ہیں۔“

گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں کی باتوں سے جو کچھ جھیلنا پڑ رہا تھا، اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دل جوئی ان الفاظ میں کی۔

سیرت مبارکہ اس طرح کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ جب قریش کو معلوم ہوا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اوپر وحی کے نازل ہونے کا اعلان کیا ہے تو ایک سردار نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کہا: ”بھتیجے! اگر تم پر کسی بدروح کا سایہ ہو گیا ہے یا کوئی آسیب آگیا ہے تو مجھے بتا دو۔ میرے بہت سارے عاملوں سے تعلقات ہیں، میں کسی کو بلا کر تمہارا علاج کروا دیتا ہوں۔“ سوچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر کیا بیتی ہوگی!

پہلے چار برس تک تو اس نوع ہی کی مخالفت ہوتی رہی اور اس کے بعد جسمانی تشدد کا بھی آغاز ہوا۔ دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ تبلیغ دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک مذہبی تبلیغ جیسے عیسائیت کی تبلیغ اور دوسری انقلابی تبلیغ جیسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کا انداز۔ اس طرح کی تبلیغ پر معاشرہ کی طرف سے پہلا ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ ایک آدمی کا دماغ خراب ہوا ہے اور چند سر پھرے نوجوان اس کے ساتھ ہو گئے ہیں مگر ان سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ بس ان کا استہزاء و تمسخر اور مذاق اڑاتے رہو۔ ان کی شخصیتوں کو داغ دار کر دو ان کی ہمتوں کو توڑ دو ان کے حوصلے پست (demoralize) کر دو۔ کئی معاشرہ میں یہی ہوا اور آج بھی جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت لے کر اٹھا جائے گا تو وہی ردِ عمل ہمارے سامنے بھی آئے گا جو اُس وقت آیا تھا۔ چنانچہ یہ درحقیقت صبر کا امتحان ہے۔ انسان کی ہمت جواب دینے لگتی ہے، قوتِ ارادی اور عزیمت مضطرب ہوتی جاتی ہے تو کیا وہ دل شکستہ ہو کر بیٹھ جائے یا استقامت کے ساتھ کام کرتا رہے!

بہر حال یہ صبر کا ایک اہم رُخ ہے کہ استہزاء، تمسخر، مذاق اڑنے، دقیاؤسی کہے جانے، ان سب چیزوں پر صبر کیا جائے۔ اگر اللہ ہمیں مقامِ دعوت پر فائز ہونے کی توفیق عطا فرمائے تو ان تمام مراحل کے حوالہ سے قرآن و سیرت محمدیہ (علیہ السلام) سے ہدایات نظر آ جاتی ہیں۔

اس مرحلہ پر دو قسم کے صبر ہمارے سامنے آئے۔ دنیاوی کریمز کی قربانی اور دعوت

کے ردِ عمل پر آنے والی مشکلات پر صبر۔ پھر صبر کی اعلیٰ ترین شکل کا بیان سورہٴ نجم السجدہ میں بایں الفاظ ہوا:

﴿وَمَا يُلْقِيهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا ۚ وَمَا يُلْقِيهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ١٥﴾

”اور یہ مقام (سعادت) نہیں حاصل ہو سکتا مگر ان ہی لوگوں کو جو بہت صبر کرتے ہوں، اور یہ (مقام) نہیں دیا جاتا مگر ان ہی کو جو بڑے نصیب والے ہیں۔“

عدم تشدد اور صبر محض کا مرحلہ

مقامِ دعوت پر فائز شخص کے لیے یہ صبر لازم ہے کہ لوگ گالیاں دیں اور وہ دعائیں دے، لوگ پتھراؤ کریں اور وہ پھول پیش کرے، لوگ ماریں تو بھی ان پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے، تاکہ دعوت کا کام آگے بڑھ سکے۔ گو شریعت میں قانون تو ہے کہ آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت، کان کے بدلے کان، لیکن مقامِ دعوت کے اعتبار سے قانون کچھ اور ہوگا یعنی جھیلو، برداشت کرو، ماریں کھاؤ، ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ اس کا نام صبر محض (Passive Resistance) ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں بارہ برس یہی قانون نافذ کیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہی کہا گیا کہ چاہے کتنا ہی مارا جائے، جواباً کوئی کارروائی نہیں ہوگی۔ مزاحمت تو کی جائے گی مگر اس طرح کہ ان کا توحید اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن چھوڑنے کا جو دباؤ ہے، اس کے خلاف ڈٹا رہا جائے، اس سے پیچھے نہیں ہٹا جائے۔ حضرات بلال، ابوفکیہہ اور خباب بن الارت وغیرہم رضی اللہ عنہم پر شدید ترین مظالم کیے جا رہے تھے اور وہ برداشت کر رہے تھے، حالانکہ جب کوئی آدمی desperate ہو جائے تو اس میں بڑی قوت آ جاتی ہے کہ اگر مجھے مرنا ہی ہے تو میں دو چار کو مار کر ہی مروں، لیکن چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی اس لیے کسی نے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ سورۃ النساء میں یہ بات آئی: ﴿كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ﴾ (آیت ۷۷) ”اپنے ہاتھوں کو روک رکھو“، گویا ڈٹے رہو، جے رہو، کھڑے رہو، جھیلو، برداشت کرو، صبر کرو، پیچھے نہ ہٹو۔ نہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن کو چھوڑنا، نہ توحید کے راستہ سے منہ موڑنا، لیکن ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں، کیونکہ ابھی انقلابی عمل کے مرحلہ سے گزر

رہے ہیں۔ ابھی تو انقلاب لانا ہے، اسلامی حکومت قائم کرنی ہے۔ جب اسلامی حکومت قائم ہو جائے تو بدلہ کا قانون لاگو ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ مکی سورتوں میں خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مختلف پیراؤں میں صبر کا حکم دیا گیا:

﴿وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُزْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا ۝۱۵﴾ (المزمل)

”اور جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں اس پر صبر کیجیے اور ان کو چھوڑ دیجیے بڑی خوبصورتی سے کنارہ کشی کرتے ہوئے۔“

﴿وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝۶﴾ (المدثر)

”اور اپنے رب کے لیے صبر کریں۔“

﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعُرْسِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ (الاحقاف: ۳۵)

”تو (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!) آپ بھی صبر کیجیے جیسے اولو العزم رسول صبر کرتے رہے ہیں۔“

﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ﴾ (القلم: ۳۸)

”تو (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم!) آپ انتظار کیجیے اپنے رب کے حکم کا۔“

﴿وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِإِلَهِ﴾ (النحل: ۱۲۷)

”اور (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم!) آپ صبر کیجیے اور آپ کا صبر تو اللہ ہی کے سہارے

پر ہے۔“

مکی معاشرہ میں غلام طبقہ کے ساتھ بہت ہی روح فرسا سلوک کیا گیا، کیونکہ اس معاشرہ میں غلاموں کے کوئی حقوق تھے ہی نہیں۔ اگر کوئی اپنے غلام کو ذبح بھی کر دے تو اس سے کوئی پوچھنے والا ہی نہیں ہوتا تھا، کیونکہ بطور مالک وہ جو چاہے سلوک اپنی ملکیت کے ساتھ کر سکتا تھا۔ اس سے کوئی باز پرس کا معاملہ نہیں تھا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو ان کا آقا امیہ بن خلف گردن میں رسی ڈال کر سخت گرم دوپہر میں مکہ کی سنگلاخ زمین پر حیوانوں کی طرح گھسیٹتا۔ کبھی تو بے رحمی کے ساتھ جلنے والی زمین پر چت لٹا کر، ایک بھاری سیل چھاتی پر رکھ دی جاتی کہ منہ سے آواز تک نہیں نکل پارہی ہوتی لیکن اس حال میں بھی ”أَحْدُ أَحَدُ“ کے الفاظ ان کی زبان پر ہوتے۔ غلام طبقہ شدید ایذا اور ابتلا کا شکار ہوا لیکن توحید اور

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر قائم رہا۔

چشم تصور سے اس بدترین روش کو دیکھیے جو ابو جہل نے حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کے خاندان کے ساتھ روا رکھی۔ حضرت یاسر رضی اللہ عنہ یمن کے رہنے والے بہت نیک انسان تھے۔ انہیں خواب میں بشارت ہوئی کہ مکہ میں آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہونے والا ہے، ان تک پہنچ جاؤ۔ اس لیے وہ یمن سے ترک وطن کر کے مکہ آ گئے۔ یہاں آ کر انہوں نے ابو جہل سے معاہدہ کیا اور اس کے حلیف بن کر رہنے لگے، کیونکہ اُس وقت مکہ میں صرف قریشی رہ سکتے تھے یا کسی قریشی کا حلیف یا کسی قریشی کا غلام۔ ابو جہل کے چچا کی کنیز حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ حضرت یاسر نے ان سے نکاح کر لیا، جن سے ایک بیٹے حضرت عمار بن یاسر ہوئے۔ جب ابو جہل کے چچا کا انتقال ہو گیا تو یہ خاندان ابو جہل کے رحم و کرم پر رہ گیا اور اس نے ایمان لانے کی وجہ سے ان تینوں افراد کے ساتھ بدترین معاملہ کیا۔ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ جو کچھ کیا گیا، اس کا تصور ممکن نہیں۔ ان کے جسم کے نازک حصوں کو جلایا جاتا۔ ابو جہل کہتا تھا کہ ایک دفعہ اقرار کر لو کہ میرے بت بھی الہ ہیں، میں تمہیں چھوڑ دوں گا لیکن یہ میاں بیوی کسی طریقہ سے تیار نہیں ہوئے۔ یہ ہے صبر، یہ ہے استقلال، یہ ہے ثبات! تنگ آ کر اس نے حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کی شرم گاہ میں برچھا مارا اور شہید کر دیا۔ حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت ہے کہ ستا ستر تنگ کر کر کے آخر کار جو انہیں شہید کیا تو اس طرح کہ چار سانڈ اونٹوں کو رستے باندھ کر ایک رستے سے ان کا ایک بازو دوسرے سے دوسرا بازو باندھا، تیسرے سے ایک ٹانگ، چوتھے سے دوسری ٹانگ باندھی اور چاروں کو دوڑایا کہ جسم کے پر نچے اڑ گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب آل یاسر کے گھر کے سامنے سے گزرتے تو فرماتے: ((صَبْرًا يَا آلَ يَاسِرٍ، فَإِنَّ مَوْعِدَكُمْ الْجَنَّةَ)) [المستدرک علی الصحیحین: ۵۶۳۶] ”صبر کرو اے آل یاسر! کہ تمہارے وعدہ کی جگہ جنت ہے۔“ ادھر آنکھ بند ہوئی، ادھر جنت میں تمہارا داخلہ ہو جائے گا۔ یہی تواصی بالصبر ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کے مطابق عمل فرما رہے تھے۔ یہاں پر ایک دوسرے پہلو کو بھی سمجھ لینا چاہیے۔ دین میں عزیمت کے ساتھ

رخصت کا پہلو بھی ہے۔ حضرت یا سر اور حضرت سمیہؓ سید الشہداء بنے۔ اسلام کی تاریخ میں سب سے پہلی جان دینے والی خاتون اور سب سے پہلے جان دینے والے شخص۔ توحید کے لیے محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کے لیے صداقت کی گواہی دیتے ہوئے بوڑھے والدین نے اپنی جانیں دے دیں، لیکن نوجوان حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے رخصت کی راہ اختیار کی۔ ان سے جھیلانیں گیا، برداشت نہیں ہو سکا۔ ایک مرتبہ کلمہ کفر زبان سے نکال دیا تو ابو جہل نے ان کو چھوڑ دیا، لیکن اب پشیمانی طاری ہوئی کہ میں کیا کر بیٹھا! اُس کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو ایک ستون سے باندھ لیا کہ حضور ﷺ ہی آکر مجھے یہاں سے کھولیں ورنہ یہیں پر اپنے آپ کو ہلاک کر لوں گا۔ حضور ﷺ خود تشریف لائے، دست مبارک سے کھولا اور کہا کہ اس کی بھی دین میں اجازت ہے کہ کلمہ کفر کہہ کر جان بچالی جائے۔ یہ رخصت کا راستہ ہے، عزیمت کا نہیں۔ تمہارے والدین نے جو مقام حاصل کر لیا، ان کو تو رتبہ بلند ملا۔ البتہ قرآن کی اس آیت سے یہ رہنمائی ملتی ہے: ﴿إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِإِلَافَةٍ﴾ (النحل: ۱۰۶) یعنی اگر دل ایمان پر جما ہوا ہو تو کسی وقت محض جان بچانے کے لیے کلمہ کفر کہہ دینے کی اجازت ہے۔ کمزور طبائع کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے دین میں accommodate کیا ہے۔ حضور ﷺ نے ان کی ہمت بندھائی کہ گھبراؤ نہیں، اگر تمہارے دل کے اوپر کوئی اثر نہیں ہے تو یہ بھی ٹھیک ہے۔

صبر محض کا فلسفہ

اس ساری صورت حال کا فلسفہ بھی سمجھ لینا چاہیے۔ جس وقت ابو جہل اس خاندان کے ساتھ یہ بدترین سلوک کر رہا تھا، اُس وقت جو تیس یا چالیس مسلمان موجود تھے وہ نعوذ باللہ نہ بے غیرت تھے اور نہ ہی بے حمیت کہ اپنے بھائی بہن کو چھڑانے کی کوشش نہ کی۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ سب صادق الایمان تھے لیکن اُس وقت تک حضور ﷺ کی طرف سے ایسا کچھ کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ ہے ڈسپلن کی وہ تربیت جو محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کی کی تھی۔ دراصل جوش میں آکر حملہ کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا یہ کہ خون کھول رہا ہو لیکن چونکہ اجازت نہیں ہے لہذا کوئی اقدام نہ کیا جائے۔ یہ زیادہ کڑا

امتحان ہے یہ زیادہ مشکل ہے اور اسی کی تربیت دی محمد رسول اللہ ﷺ نے۔ مکی دور کے ۱۲ سالوں میں سے ابتدائی ۴ سال صرف زبانی کلامی ایذا تھی، اور اس کا ہدف صرف حضور ﷺ کی ذاتِ مبارک تھی۔ ان کو شاعر، ساحر، مجنون کہا گیا۔ کسی نے کہا کہ انہوں نے ایک عجی غلام کو گھر میں رکھا ہوا ہے، اس سے dictation لیتے ہیں اور ہم پر رعب جماتے ہیں کہ وحی نازل ہوئی ہے۔ یہ سب کچھ چار برس تک حضور ﷺ کے ساتھ ہوتا رہا تا کہ آپ ﷺ کو اتنا demoralize کر دیا جائے کہ ہمت ختم ہو جائے۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ نہ حضرت محمد ﷺ بد دل ہوئے اور نہ ان کے ساتھی، بلکہ یہ دعوت پھیلتی جا رہی ہے۔ ہمارے نوجوان ان کے حلقہ میں شامل ہو رہے ہیں۔ حضرت مصعب بن عمیر، حضرت عثمان غنی، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جیسے قریش کے اعلیٰ گھرانوں کے چشم و چراغ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی جب انہوں نے دیکھا کہ ہمارے غلاموں میں بھی یہ آگ پھیل گئی ہے تو یوں سمجھیے جیسے بارود کے اندر آگ سی لگ گئی۔ ابھی تک تو ہم ان پر ظلم کر رہے تھے لیکن ان کے اندر اگر یہ ایمان اور اسلام کی دعوت و تحریک پھیل گئی تو ہمارا اقتدار، ہمارا پورا نظام چوٹ ہو جائے گا۔ لہذا اب اپنی پوری قوتوں کو جمع کرو، انہیں مارو اور کچل دو۔ یہ کام ہوا ہے ۴ نبوی سے ۱۲ نبوی تک۔ آٹھ برس تک physical persecution کا معاملہ ہوا۔ نوجوانوں پر تشدد مار پیٹ، جلانا، دھکتے ہوئے انگاروں پر لٹانا، زنجیریں ڈال دینا، گھروں میں بند کر دینا، بھوکے رکھنا جیسے ظلم کیے گئے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کے چچا نے ایک چٹائی کے اندر لپیٹا اور ایسی دھونی دی کہ دم گھٹا جا رہا ہے، جان نکل رہی ہے۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ ایسے نوجوان تھے جن کا دوسو درہم کا جوڑا شام سے تیار ہو کر آتا تھا۔ جدھر سے نکل گئے، ان کی خوشبو کی وجہ سے پوری گلی معطر ہو گئی۔ ان کا باپ تو مرچکا تھا، دولت بہت چھوڑ کر گیا تھا، لہذا ماں نے بڑے ناز و نعم اور لاڈ پیار میں پالا۔ عرب کے معاشرے میں چونکہ عورت کی کوئی حیثیت نہیں تھی، اس لیے سربراہ خاندان چچا تھا۔ چچا نے کہا: ”مصعب! اگر تم نے اپنے باپ کا دین چھوڑ دیا ہے تو اس کی دولت پر بھی تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔ نکل جاؤ گھر سے!“ اس نے یہ

سوچا کہ توحید کا یہ سارا نشہ ہرن ہو جائے گا، لیکن حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کا جواب بالکل برعکس تھا۔ فرمایا: ”اچھا ٹھیک ہے چچا جان۔ میں گھر چھوڑتا ہوں۔“ وہی بات جو کبھی کہی تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے کہ جب اس نے کہا تھا: جاؤ چلے جاؤ، دُور ہو جاؤ میری نگاہوں سے، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا تھا: ”ابا جان! آپ کا حکم یہی ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔ آپ پر سلامتی ہو۔ میرا رب مجھ پر بڑا مہربان ہے۔ میں اس سے آپ کے لیے استغفار کروں گا۔“ یہ کہہ کر چل دیے۔ قریش حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی نسل سے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک بیٹے حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کے ساتھ وہی معاملہ ہوا۔ وہ بھی توحید کے لیے گھر چھوڑ کر نکلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ غصہ میں آ کر چچا نے اگلی بات کہی: ”یہ کپڑے جو تم نے پہنے ہوئے ہیں یہ بھی مشرک باپ کی کمائی سے ہیں“ اتاروا ان کو!“ انہوں نے کپڑے بھی اتار دیے۔ مادرِ زاد برہنہ گھر سے نکالے گئے۔ ایک ٹاٹ کا ٹکڑا لپیٹ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مدینہ کے بارہ افراد ایمان لائے، بیعت عقبہ اولیٰ ہوئی تو انہوں نے کہا کوئی اپنا شاگرد دیجیے جو ہمیں قرآن پڑھا سکے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا: ”مصعب!“ اب مدینہ جاؤ، یثرب والوں کو قرآن پڑھاؤ، انہیں تبلیغ کرو۔“ حضرت مصعبؓ وہاں گئے اور ایک سال کی محنت کی کمائی ۷۵ افراد اگلے سال لا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جھولی میں ڈال دیے۔ ۷۲ مرد اور ۳ عورتوں نے بیعت عقبہ ثانیہ کی۔ ان ۷۵ افراد کی درخواست ہی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے گئے تھے۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ غزوۂ اُحد میں شہید ہوئے اور اُس وقت ان کے جسم پر صرف ایک چادر تھی۔ اس جنگ میں مسلمانوں کا جھنڈا اُن کے ہاتھ میں تھا۔ جب ایک ہاتھ کٹ گیا تو جھنڈا دوسرے ہاتھ سے تھام لیا اور دوسرا بھی کٹ گیا تو دونوں ہاتھوں کے بچے ہوئے حصوں سے جھنڈے کو تھام لیا، گرنے نہیں دیا یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ ان کی شکل و صورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت مشابہ تھی اس لیے خبر اُڑ گئی کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے۔ جب ان کو دفن کرنے کا وقت آیا تو شہید کے لیے کفن وہی لباس ہوتا ہے جو اُس نے

شہادت کے وقت زیب تن کر رکھا ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مسئلہ پیش کیا گیا کہ ان کے جسم پر تو ایک چادر ہے اور وہ اتنی چھوٹی ہے کہ اس سے اگر سر ڈھانپتے ہیں تو پیر کھل جاتے ہیں اور اگر پیر ڈھانپتے ہیں تو سر کھل جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”سر چادر سے ڈھانپ دو اور پیروں پر گھاس پھونس ڈال دو۔“ یہ آخری لباس ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دیوانے کو دنیا سے رخصت ہوتے وقت ملا ہے جس کا دو دو سو درہم کا جوڑا سلتا تھا۔ صبر و برداشت کی اعلیٰ مثال! اصل میں یہی چیزیں ہیں جو ہمارے دل کو منور کرتی ہیں۔ وہ نورِ ایمان کے علم بردار تھے۔

جان لیجیے کہ دینی فرائض کی تیسری منزل یعنی اقامتِ دین کی جدوجہد میں صبر کا پہلا درجہ ہوگا صبرِ محض۔ مکی دور کا فلسفہ یہی Passive Resistance ہے، خصوصاً آٹھ سال تک۔ دراصل انقلابی عمل میں یہ طرزِ عمل بہت فیصلہ کن چیز ہے، کیونکہ آغاز میں انقلابی لوگ تعداد میں کم ہوتے ہیں جبکہ جو نظام قائم ہے اس کے پاس بہت زیادہ طاقت ہوتی ہے۔ اگر وہ شروع ہی سے پُر تشدد (violent) ہو جائیں گے تو اس نظام کو اخلاقی جواز حاصل ہو جائے گا ان لوگوں کو کچل دینے، ختم کر دینے کا۔ جب وہ ہاتھ نہیں اٹھاتے تو نظام کے پاس ظلم و تشدد کا کوئی اخلاقی جواز نہیں رہتا۔ اگر پھر بھی مار رہے ہیں تو ایسے میں عوام الناس کی دلی ہمدردیاں انقلابیوں کے ساتھ ہوتی چلی جاتی ہیں۔ یہ اُمیہ بن خلف نے بلالؓ کو آج اتنا مارا تو کیوں مارا؟ کیا اُس نے کوئی چوری کر لی تھی؟ نہیں۔ کیا کوئی اور گستاخی کی تھی اپنے آقا کی؟ نہیں۔ بس صرف یہ وجہ ہے کہ وہ ایک اللہ کو مانتا ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آیا ہے۔ اس صورتِ حال کا کیا اثر ہوگا؟ سوچیے! ایک زندہ انسان کو دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹایا جا رہا ہے۔ ان انگاروں سے کمر کی کھال جلی، چربی پگھلی اور اس پگھلنے والی چربی سے وہ انگارے ٹھنڈے پڑے۔ یہ سب کچھ وہ جھیل رہا ہے۔ دیکھنے والوں نے ضرور سوچا ہوگا کیا جرم تھا اس کا! یہ سب کچھ حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آیا۔ آپؐ پیشے کے لحاظ سے لوہار تھے۔ شریف آدمی، بہت اچھے کاریگر تھے۔ وقت پر کام کر دیتے، مناسب اجرت لیتے۔ ان کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ

ایک اللہ کو مانتے اور حضرت محمد ﷺ کے دامن سے وابستہ ہیں۔

ہر معاشرہ میں ایک خاموش اکثریت (silent majority) ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی معاشرے میں اکثریت ہمیشہ خاموش ہی ہوتی ہے۔ البتہ وہ اندھی بہری نہیں ہوتی۔ دیکھ رہی ہوتی ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ سن رہی ہوتی ہے کہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ کچھ شریف لوگوں پر تشدد ہو رہا ہے ان کی کوئی خطا نہیں سوائے اس کے کہ ایک اللہ کو مانتے ہیں تو اندر ہی اندر وہ خاموش اکثریت بدلنے لگتی ہے۔ اس میں اگرچہ اتنی جرات تو نہیں ہوتی کہ حق بات کا برملا اعلان کریں لیکن ان کے دل بدل رہے ہوتے ہیں۔ آٹھ برس میں حضرت محمد ﷺ نے قریش کے دل فتح کیے۔ چاہے وہ ایمان نہیں لائے لیکن اندر سے انہیں نظر آ رہا تھا کون کیا ہے! یہ صبر محض ہے۔

سیرتِ طیبہ میں انقلابی جدوجہد کے مراحل

انقلابی جدوجہد میں سب سے پہلے تو انقلابی نظریہ کی اشاعت ہوتی ہے۔ جو لوگ اس کو قبول کر لیں، انہیں organize کیا جاتا ہے، ایک جماعت کی شکل دی جاتی ہے۔ پھر ان کی تربیت ہوتی ہے۔ جیسا انقلاب لانا ہے ویسی ہی تربیت کرنی ہوگی۔ پھر باطل نظام سے ٹکراؤ کا مرحلہ آئے گا۔ جب تک اتنی تعداد نہ ہو کہ آپ فیصلہ کن اقدام کر سکیں، اس وقت تک دعوت ہی دینی ہے۔ لوگوں کی نفی اپنے اندر شامل کرنی ہے۔ اپنی قوت بڑھانی ہے۔ اپنی تربیت و اصلاح کرنی ہے اور صبر کرنا ہے۔ retaliate نہیں کرنا، اقدام نہیں کرنا، جوابی کارروائی نہیں کرنی۔ یہ وہ کام ہے جو بارہ برس ہوا۔ پھر جب ایسے جاں نثاریوں کی ایک devoted اور dedicated تعداد تیار ہوگئی جو منظم و تربیت یافتہ تھی، سختیوں کی بھٹیوں سے نکلے ہوئے لوگ، منظم ایسے کہ حضور ﷺ کے ہر حکم پر عمل پیرا، سمع و طاعت کے خوگر، تو اب باطل نظام کے خلاف اقدام کر سکتے ہیں۔ تبھی جا کر مدنی دور میں اقدام کا مرحلہ آیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ایک دوسری جگہ عطا فرمادی یعنی مدینہ منورہ، تو یہ base ملنے کے بعد اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طاقت میسر آنے کے بعد ہی انقلابی عمل میں اقدام کا مرحلہ آیا۔ دورانِ سفر ہجرت جب حضور ﷺ مکہ سے مدینہ تشریف لے جا رہے

تھے، سورۃ الحج کی یہ آیت نازل ہوئی:

﴿اِذْ لِلَّذِينَ يُقْتُلُونَ بِاَنَّهُمْ ظُلُمًا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌۭ﴾

”اجازت دی جا رہی ہے (قتال کی) ان لوگوں کو جن پر جنگ مسلط کی گئی ہے اس

لیے کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے۔ اور یقیناً اللہ ان کی نصرت پر قادر ہے۔“

جن پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے ان کے لیے ابھی تک حکم تھا کہ ہاتھ باندھے رکھو آج سے ان کے ہاتھ کھول دیے گئے کہ تم بدلہ لے سکتے ہو، جوابی کارروائی کر سکتے ہو۔ یہ آیت ٹرننگ پوائنٹ ہے اگلے مرحلہ کے لیے۔ اس موقع پر حضور ﷺ نے جو کچھ کیا، سیرت کی کتابوں میں وہ واقعات موجود ہیں۔ ان واقعات کی اہمیت کیا ہے؟ ان سے نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ اس جانب زیادہ توجہ نہیں کی گئی۔

حضور ﷺ نے مدینہ پہنچ کر چھ مہینے تو کوئی اقدام نہیں کیا بلکہ صرف اپنی پوزیشن کو consolidate کیا۔ تین اہم کام کیے، مسجد نبویؐ کی تعمیر، جو کہ بطور ایک مرکز وجود میں آئی۔ وہی آپ کی تربیت گاہ ہے، خانقاہ ہے، وہی گورنمنٹ ہاؤس ہے، وہی درس گاہ ہے، اصحاب صفہ کا ٹھکانا ہے، نماز باجماعت، خطبہ جمعہ، سب کچھ مسجد نبویؐ میں ہو رہا ہے۔ دوسرا کام یہ کیا گیا کہ یہودی قبائل کو معاہدوں میں جکڑ لیا تاکہ مدینہ کا جوائنٹ ڈیفنس کیا جاسکے۔ یہ طے ہو گیا کہ اگر مدینہ پر حملہ ہوگا تو مل جل کر دفاع کریں گے۔ یہ ایک بہت دُور بینی اور پیش بندی کا اقدام محمد رسول اللہ ﷺ نے کیا۔ تیسرا کام تھا مواخات۔ مہاجرین اور انصار کو جوڑ کر ایک وحدت بنا دیا جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ ایک انصاری، ایک مہاجر بھائی بھائی ہو گئے۔ انصار نے گھر تقسیم کر دیے، دکانیں تقسیم کر دیں، کاروبار بانٹ لیے۔ یہاں تک واقعہ ملتا ہے کہ ایک انصاری صحابیؓ اپنے مہاجر بھائی کو گھر لے گئے اور فرمایا: ”یہ میری دو بیویاں ہیں۔ ان میں سے جو تمہیں پسند ہو، اسے میں ابھی طلاق دے دوں گا تاکہ تم اس سے شادی کر لو۔“ واضح رہے کہ یہ واقعہ ایک ہجری میں ہو رہا ہے جبکہ پردے کا حکم بعد میں آیا ہے۔ سورۃ النور اور سورۃ الاحزاب ۵ اور ۶ ہجری میں نازل ہوئیں۔ اس سے پہلے پردے کا حکم نہیں تھا۔

ان تین اقدامات کے بعد آپ ﷺ نے اب چھاپہ مار دستے بھیجنے شروع کر دیے یعنی مکہ والوں کے خلاف اقدام۔ جدید اصطلاح میں دو کام کیے:

(۱) معاشی ناکابندی (Economic blockade of Makkah)

(۲) سیاسی ناکابندی (Political isolation of Quraish)

حضور ﷺ مدینہ کے اطراف میں قبائل کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے آپ نے معاہدے کر لیے۔ چنانچہ وہ قبیلہ جو پہلے قریش کا حلیف تھا، اب حضرت محمد ﷺ کے ساتھ ہو گیا۔ قریش کی isolation ہو رہی ہے جبکہ حضور ﷺ کی قوت بڑھ رہی ہے۔ قریش کے تجارتی قافلے شام اور یمن جاتے تھے۔ شام کی طرف کا راستہ بدر کے پاس سے گزرتا تھا اور یمن کا راستہ طائف سے ہو کر جاتا تھا۔ حضور ﷺ نے دونوں راستوں پر دستے بھیجنے شروع کر دیے۔ ایک لشکر خاص طور پر نخلہ بھیجا بلکہ لشکر بھی کیا، ایک چھوٹا سا چھاپہ مار دستہ جو بارہ افراد پر مشتمل تھا۔ حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ اس کے کمانڈر تھے۔ انہیں حضور ﷺ نے ایک خط مہر لگا کر دیا کہ مدینہ سے دودن کی مسافت پر باہر نکل کر اسے کھولنا اور اس پر جو ہدایات لکھی ہیں ان پر پوری طرح عمل کرنا۔ اتنی رازداری رکھی گئی تھی۔ جب وہ مدینہ سے دودن کے فاصلے پر باہر چلے گئے تو خط کھولا۔ لکھا تھا کہ وادی نخلہ میں قیام کرو وہاں قریش کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھو اور ہمیں اطلاع دیتے رہو۔

یہ لوگ تین سو میل کا سفر کر کے وہاں پہنچے تھے۔ اتفاق سے قریش کا ایک قافلہ وہاں سے گزر رہا تھا جس سے مسلمانوں کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ مقابلہ ہوا تو قریش کا ایک آدمی جو مشرک تھا، مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ دو کو انہوں نے گرفتار کر لیا، باقی بھاگ گئے۔ جو مال غنیمت ہاتھ آیا اسے لے کر حضور ﷺ کے پاس آ گئے۔ آپ ﷺ ناراض ہوئے کہ میں نے تمہیں اس کا حکم نہیں دیا تھا۔ میں نے صرف یہ کہا تھا کہ وہاں قیام کر کے ہمیں اطلاعات دیتے رہو۔ البتہ یہ بات ریکارڈ پر آ جانی چاہیے کہ ہجرت کے بعد جو پہلا قتل ہوا، وہ مسلمانوں کے ہاتھوں ایک مشرک کا ہوا۔ اس بات نے مکہ میں آگ لگا دی کہ

اتنی جرأت ہو گئی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھیوں کی! ادھر ابوسفیان کا ایک تجارتی قافلہ مکہ واپس آ رہا تھا۔ اس نے مکہ والوں کی طرف ایک پیغام پہنچایا کہ میرے قافلے کو (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے آدمیوں سے خطرہ ہے، لہذا فوراً مدد کا کوئی انتظام کرو۔ یہ ہے وہ چیز جس کی آڑ لے کر ابو جہل جیسے لوگوں نے مکہ میں ایک لشکر تیار کر لیا اور بدر کی طرف مارچ کیا۔

مسلم تصادم میں صبر کی خاص اہمیت

یہاں سے پہلی جنگ کا آغاز ہوا۔ حضور ﷺ کی طرف سے اقدام کا آغاز ہوا جو مسلح تصادم (Armed Conflict) تک پہنچا۔ یہ ۲ ہجری کی بات ہے، اور پھر یہ جاری رہا ۸ ہجری تک۔ اندرون ملک عرب تصادم کے یہ چھ سال ہیں۔ اس عرصے میں غزوہ بدر، غزوہ احد، غزوہ احزاب، یہ سارے غزوات ہو گئے۔ پھر فتح مکہ، غزوہ حنین اور تبوک کی جانب پیش قدمی ہوئی۔ ۸ ہجری تک یہ معاملہ مکمل ہو گیا۔

﴿وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا ١٨﴾

(بنی اسرائیل)

مدنی دور میں آ کر سورۃ البقرہ میں ارشاد ہوا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ

الصَّابِرِينَ ١٥٩﴾

”اے اہل ایمان! مدد حاصل کرو صبر اور نماز سے۔ بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

اب تمہاری جد و جہد کا یہ نیا phase شروع ہو چکا ہے۔ کئی دور میں جد و جہد کا کچھ اور تقاضا تھا جبکہ مدنی دور میں کچھ اور درکار ہے۔ اب نظامِ باطل کو چیلنج کرنا ہے۔

﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنَّ لَّا

تَشْعُرُونَ ١٥٨﴾ (البقرہ)

”اور ہرگز نہ کہو انہیں جو اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں کہ وہ مردہ ہیں، بلکہ وہ زندہ ہیں

لیکن تمہیں (ان کی حیات کا) شعور نہیں۔“

آگے صبر کے موضوع پر اہم ترین مقام ہے:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ﴾ (البقرة: ۱۵۵)

”اور دیکھو ہم تمہیں لازماً آزمائیں گے کسی قدر خوف کی کیفیت سے اور بھوک (فقر اور فاقہ) سے اور مالوں، جانوں اور پھلوں کے نقصان سے۔“

اس کا مفہوم ایک اور بھی ہے۔ ایک تو یہ کہ جیسے کھجور کی فصل تیار ہے اور غزوہ تبوک کے لیے جانے کا حکم مل گیا تو اندیشہ ہوا کہ کون اُتارے گا؟ اگر کھجور وقت پر نہیں اُتری تو برباد ہو جائے گی۔ یہ ہوتا ہے پھلوں کا نقصان۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہ بسا اوقات بہت سی محنتوں کا نتیجہ انسان دیکھتا ہے کہ ضائع چلا گیا۔ دس سال محنت کی، کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ چنانچہ ثمرات محنتیں بھی ہیں۔ محنتوں کے ثمرات کا ضیاع! آپ اگر انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں اور ایک کوشش ناکام ہو جائے تو کوئی پروا نہیں۔ پھر اگلی کی تیاری کریں۔ انگریزی محاورہ ہے:

Hope for the best, but be prepared for the worst.

ایسا نہ ہو کہ دوسری مرتبہ ناکام ہو کر بد دل ہو جاؤ۔ چاہے تمہاری ہمتیں جواب دے جائیں لیکن پہلے سے زیادہ تیاری کے ساتھ پھر کوشش کی جائے۔ جب تک کامیابی حاصل نہیں ہو جاتی، ہمیں یہ کام کیے چلے جانا ہے۔ بقول فیض:

یہ فصل اُمیدوں کی ہمد
سب محنتِ صبحوں شاموں کی
اس بار بھی غارت جائے گی
اب کے بھی اکارت جائے گی

یہ سیرتِ نبوی ﷺ ہی کے واقعات ہیں کہ بدر میں مسلمانوں کو فتح ہوئی تو اُحد میں شکست پہنچی۔ ۷۰ صحابہؓ شہید ہو گئے۔ اگر اُس وقت مسلمان ہمت ہار بیٹھتے تو گاڑی کیسے آگے چلتی!

﴿وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ﴾

”اور (اے نبی ﷺ!) بشارت دے دیجیے صبر کرنے والوں کو۔“

﴿الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾

”وہ لوگ کہ جب ان پر کوئی تکلیف آئے (کوئی مصیبت، کوئی آزمائش آئے) وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور ہمیں اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔“

وہ ہمارا مولا ہے، ہمارا آقا ہے۔ اگر اسے یہی منظور ہے تو ہمیں بھی یہی منظور ہے۔ مع ”سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے!“ مولانا محمد علی جوہر ایک مرتبہ جیل گئے تو انہیں اپنی جوان بیٹی کی بیماری کی خبر آئی۔ انہوں نے اس وقت ایک نظم لکھی جس کے دو شعر یہ ہیں:۔

میں ہوں مجبور، پر اللہ تو مجبور نہیں تجھ سے میں دُور سہی وہ تو مگر دُور نہیں!
تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں!
یعنی تیری صحت ہمیں چاہیے تو ضرور لیکن اگر ہمارے رب کو منظور نہیں تو ہمیں بھی منظور نہیں۔ یہ ہے راضی برضائے رب کی مطلوب کیفیت! جب تک بندہ مومن کی یہ کیفیت نہ ہو وہ میدانِ عمل میں ثابت قدم نہیں رہ سکتا۔ آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾ ”اور یہی ہیں وہ لوگ جو ہدایت پانے والے ہیں۔“

صبر اور مصابرت: لازم و ملزوم

سورہ آل عمران کی آخری آیت میں صبر کے حوالہ سے دو اہم الفاظ آئے ہیں:
﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَاطِبُوا ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾

”اے ایمان والو! صبر کرو اور صبر میں اپنے دشمنوں سے بڑھ جاؤ اور مربوط رہو۔ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔“

یہاں صبر اور مصابرت کے دو الفاظ آئے ہیں اور ان کا باہم وہی تعلق ہے جو جہد اور جہاد کا ہے۔ صبر یک طرفہ عمل ہے۔ آپ جھیل رہے ہیں، برداشت کر رہے ہیں۔ صبر علی المعصیۃ، صبر علی الطاعة، صبر علی الابتلاء، یہ سب صبر ہیں۔ مصابرت ہے ماہنامہ میثاق (60) ستمبر 2026ء

ماہنامہ میثاق (59) ستمبر 2026ء

صبر کا صبر سے مقابلہ۔ اسی سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے کہا: تمہیں زک پہنچی ہے تو انہیں بھی تو پہنچی تھی۔ بدر میں ان کے بھی ۱۰ مارے گئے تھے مگر ان کے حوصلے تو پست نہیں ہوئے۔ وہ اگلے سال پھر تم پر چڑھائی کر کے آگئے۔ تم کیوں اتنا بُرا مان رہے ہو۔ تمہارے دل اتنے زخمی کیوں ہو گئے۔ تم اگر توحید کے لیے لڑ رہے ہو تو دیکھتے نہیں کہ ابو جہل نے شرک کے لیے گردن کٹا دی۔ آج بھی لوگ باطل نظریات کے لیے کتنی قربانیاں دے رہے ہیں۔ باطل چیزوں کے فروغ کے لیے کتنی محنتیں کر رہے ہیں۔ ہمارے کتنے نوجوان ہیں جو اپنے آپ کو دین کے لیے وقف کر دیں، خاص کر کھاتے پیتے گھرانوں کے لوگوں میں سے؟ باصلاحیت لوگ، کھاتے پیتے لوگ، ذہنی استعداد رکھنے والے لوگ، وقف کریں اپنے آپ کو دین کے لیے۔ اس کے بغیر کیسے بہار آجائے گی؟ کیسے رونق آجائے گی؟ دنیا میں باطل نظریات والے لوگ بھی قربانیاں دیتے ہیں، جانیں دیتے ہیں۔ تو فرمایا اگر تم ان سے زیادہ قربانی نہیں دو گے تو اللہ کی زمین پر اللہ کا دین کیسے غالب ہوگا!

اگر حق کو غالب کرنا صرف اللہ کے ذمہ ہو تو وہ آں واحد میں غالب کر سکتا ہے۔ لوگوں کو تکلیف دینے کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے مقابلہ میں کسی باطل کی طاقت کا ٹھہرنا ممکن نہیں۔ اللہ کو تو ہمارے ایمان کا امتحان اور خلوص کی آزمائش درکار ہے۔ اللہ تعالیٰ دیکھنا چاہتا ہے کون اس کے لیے اپنی جان قربان کرنے کے لیے تیار ہے؟ تن من دھن لگانے کے لیے تیار ہے؟ کفار، مشرکین، ملحدین اپنے باطل نظریات کے لیے جو کچھ قربانیاں دیتے ہیں، جس صبر کا مظاہرہ کرتے ہیں، تم اگر اپنے مقصد کے لیے اس سے زیادہ صبر کا ثبوت نہیں دو گے تو حق غالب نہیں ہو سکے گا۔ اسی لیے فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا﴾ — نہ صرف یہ کہ صبر کرو بلکہ صبر میں اپنے دشمن سے آگے نکلو۔ ان کے صبر سے بڑھ کر صبر کرو ﴿وَزَابِطُوا﴾ — مرابطہ کہتے ہیں چوکس رہنا، ہوشیار رہنا، پہرہ دینا۔ ایسا نہ ہو کہ دشمن تمہاری غفلت میں تمہارے اوپر حملہ کر دے۔

جب مکہ کے سرداروں کو یقین ہو گیا کہ تشدد کا طریقہ ناکام ہو گیا ہے، نہ حضرت ماہنامہ **میثاق** (61) ستمبر 2026ء

محمد صلی اللہ علیہ وسلم بدول ہوئے نہ ان کے ساتھی تو انہوں نے دوسرا پانسہ پھینکا۔ پہلی تدبیر استہزاء، تمسخر، مذاق، demoralize کرنا تاکہ یہ لوگ بتا شے کی طرح بیٹھ جائیں۔ معلوم ہوا کہ نہیں، یہ تو کھڑے ہیں تو دوسرا وار مارا گیا کہ ستاؤ، تلکیفیں دو، ہوکا مارو، دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹاؤ، ہلاک کرو۔ معلوم ہوا کہ یہ حربہ بھی ناکام ہو گیا۔ اس تمام تر تعذیب (persecution) سے ایک شخص کو بھی نہ توحید سے ہٹا سکے نہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے برگشتہ کر سکے، بلکہ بات آگے ہی بڑھ رہی ہے۔ ہم نے جتنا دبا یا، یہ اتنا ہی اُبھر رہا ہے۔ چنانچہ اب تیسرا وار آیا۔ ایک سفارش آئی ابوطالب کے پاس، دیکھو تمہارا بھتیجا ہمارے معبودوں کو باطل ٹھہرا رہا ہے، ہم تنگ آ چکے ہیں۔ اگر تو اُسے بادشاہت چاہیے تو ہم اُسے اپنا بادشاہ مان لیں گے۔ اگر اُسے دولت چاہیے تو وہ اشارہ کرے ہم سیم وزر کے انبار اس کے قدموں میں لگا دیں گے۔ کہیں نکاح کرنے کا اشارہ کر دے تو جس اونچے سے اونچے گھرانے میں وہ کہے گا ہم اس کی شادی کر دیں گے۔ یہ تینوں ہی دنیا کے لالچ تھے۔ بہر حال یہ مرحلے تحریکوں کے لیے بہت ہی نازک ہوتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ سے تو اس کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ کوئی اور ہو تو سوچے گا کہ یہ بادشاہ بنا رہے ہیں تو بن جاؤ۔ اس وقت تھوڑا سا کمپر ومانز کر لو، پھر ہاتھ میں قوت آجائے گی تو سب ٹھیک کر لیں گے۔ وہ بھی ٹھیک نہیں۔ صحیح طریقہ ہوگا اسی پر اس سے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا۔ دراصل یہ تمام temptations ہوتی ہیں۔ راستے سے بھٹکانے کی کوشش کہ دباؤ سے نہیں مانے تو یہ لالچ انہیں ہٹا دے گا۔ چچا نے جب بات کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تو آپ نے فرمایا: ”چچا جان! اگر وہ میرے داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیں تب بھی میں یہ کام نہیں چھوڑ سکتا۔“ صبر یہی ہے کہ اپنے طے کردہ راستے پر بڑھتے چلے جانا۔ کسی لالچ اور دباؤ میں نہ آنا۔ نہ کسی تکلیف، ایذا، استہزاء سے متاثر ہوئے بغیر اپنی منزل کی طرف پیش قدمی کیے چلے جانا۔

انقلابی عمل میں صبر کے دوران پہلا مرحلہ آتا ہے Passive Resistance یعنی صبر محض۔ جھیلو، برداشت کرو، کوئی مزاحمت (retaliation) نہیں کرنی۔ پھر ماہنامہ **میثاق** (62) ستمبر 2026ء

ایک مرحلہ وہ آتا ہے کہ آگے بڑھ کر نظامِ باطل کو چیلنج کیا جاتا ہے یعنی مصابرت (Active Resistance) اور پھر جنگ (Armed Conflict) ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًا كَأَتَهُمُ بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ ۝﴾ (الصف)

”بے شک اللہ پسند فرماتا ہے ان لوگوں کو جو قتال کرتے ہیں اللہ کے راستے میں صف در صف جیسے کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔“

سورۃ التوبہ میں فرمایا گیا:

﴿إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنْ لَهُمُ الْجَنَّةُ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لِيُقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَعَدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوَارِثِ وَالْإِنْجِيلِ وَالْقُرْآنِ ۚ وَمَنْ أَوْفَى بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُمْ بِهِ ۚ وَذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝﴾

”اللہ نے مؤمنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لیے ہیں اور اس کے عوض ان کے لیے جنت (تیار کی) ہے۔ یہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں تو مارتے بھی ہیں اور مارے (شہید) بھی (کیے) جاتے ہیں۔ یہ تورات، انجیل اور قرآن میں سچا وعدہ ہے جس کا پورا کرنا اسے ضرور ہے۔ اور اللہ سے زیادہ وعدہ پورا کرنے والا کون ہے تو جو سودا تم نے اس سے کیا ہے اس سے خوش رہو۔ اور یہی بڑی کامیابی ہے۔“

اسی طرح سورۃ آل عمران میں ارشاد فرمایا:

﴿وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ﴾ (آیت ۱۴۰)

”یہ دن ہیں جن کو ہم اُلٹ پھیر کرتے رہتے ہیں لوگوں کے مابین۔“

محمد رسول اللہ ﷺ کے جاں نثاروں نے غزوہ احزاب کے موقع پر یہ شعر پڑھا تھا:

نَحْنُ الَّذِينَ بَايَعُوا مُحَمَّدًا عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِينَا أَبَدًا

”ہم وہ ہیں جنہوں نے حضرت محمد ﷺ سے بیعت کی ہے جہاد کی۔ (اب یہ

جہاد یہ قتال، یہ جنگ، یہ سرفروشی، یہ جاں فشانہ جاری رہے گی) جب تک ہماری جان میں جان ہے۔“

یا تختِ یاتختہ! یا تو اللہ کا دین غالب ہوگا یا ہم اپنی جان اسی کام میں لگا کر اللہ کے حوالے کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اس کی توفیق دے۔

آج کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلی سطح پر اللہ کی بندگی، خود اسلام و اطاعت میں صبر علی المعصیہ، صبر علی الطاعة۔ دوسری سطح پر یعنی دعوت و تبلیغ میں اپنے کریئر، اپنے خوش نما مستقبل پر صبر اور سب سے زیادہ استہزاء، تمسخر، مذاق، فقرے اور جملے جھیلنا۔

﴿وَاضِدُّ عَلَى مَا يَقُولُونَ﴾۔ تیسری سطح اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لیے انقلاب لانے کے لیے صبر۔ ایک صبر محض ہے اور ایک مصابرت ہے۔ ایک یہ کہ جھیلو برداشت کرو لیکن ہاتھ نہ اٹھاؤ، جبکہ ایک یہ کہ آگے بڑھو باطل کو لاکارو اور سامنے والے سے مقابلہ کی صورت میں جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آ جاؤ۔ یہ چھ قسم کے صبر ہیں۔ دو، دو صبر ہر لیول کے ہیں۔ دینی فرائض کے تینوں لیول سامنے ہوں گے تو ہی جہاد کے درجات اور صبر کے مراتب بھی بہتر طور پر سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صبر و جہاد کی توفیق عطا فرمائے!

میری زندگی کا مقصد تیرے دیں کی سرفرازی

میں اسی لیے مسلمان، میں اسی لیے نمازی!

أَقُولُ قَوْلِي هَذَا وَاسْتَغْفِرُ اللَّهَ لِي وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت، اہمیت و لزوم اور مراحل و مدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کا ایک جامع خطاب

قیمت: 180 روپے

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم

حافظ محمد اسد ☆

رحمت کا لفظ پڑھتے اور سنتے ہی انسانی ذہن محبتوں اور عنایات کی روح پرور وادیوں کی طرف پرواز شروع کر دیتا ہے۔ گناہ گار خود کورحمتوں کے حصار میں محسوس کرتا ہے، اپنی کمزوریاں اور خطائیں دھلتی ہوئی محسوس کرتا ہے۔ چشمِ تصور سے اس وقت کا مشاہدہ کریں جب انسانیت شاید رحمت و عطا کے معانی سے ہی نا آشنا ہو چکی تھی۔ جنگ و جدال اور قتل و غارت خاندانی تفاخر کا سبب تھے۔ زنا کاری اور شراب نوشی وجہ امتیاز تھی۔ انتقام اور بدلے کی آگ انسانی وجود کو کھا رہی تھی۔ انسان وحشیوں سے بھی بدتر روپ دھار چکا تھا۔ وحشی درندے بھی اپنی نوزائیدہ اولاد کو زندہ درگور نہیں کرتے اور نہ ہی قتل کرتے ہیں، لیکن انسان یہ حد بھی پار کر چکا تھا۔ ایسے میں پروردگار عالم نے کائنات ارضی پر کرم فرمایا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود مسعود کی شکل میں اپنی رحمت سے نوازا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری تمام مخلوقات کے لیے باعثِ راحتِ جاں تھی۔ ہر کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود کو اپنے لیے رحمت و عطا سمجھنے لگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور افکار نے بنی نوع انسان کو قتل و غارت گری اور دنگا فساد سے نکال کر محبت و الفت کے بندھن میں پرو دیا۔ انسان رشتوں کے تقدس اور اہمیت کو سمجھنے لگا۔ ماں کی ذات جس کا بڑھا ہوا انتہائی تکلیف اور کس پرسی سے گزرتا تھا، یہ ہمارے رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ہی کا اثر تھا کہ لوگ اسی ماں کے قدموں تلے جنت تلاش کرنے لگے۔ بیٹیوں کو اپنے لیے عار اور شرمندگی محسوس کرنے والے لوگ ان کے وجود کو باعثِ رحمت سمجھنے لگے۔

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا، قَالَتْ: دَخَلْتُ عَلَى امْرَأَةٍ وَمَعَهَا ابْنَتَانِ لَهَا، تَسْأَلُ، فَلَمْ تَجِدْ عِنْدِي شَيْئًا غَيْرَ تَمْرَةٍ وَاحِدَةٍ، فَأَعْطَيْتُهَا إِيَّاهَا،

☆ استاذِ قرآن اکیڈمی، بلین آباد، کراچی

فَقَسَمْتُهَا بَيْنَ ابْنَتَيْهَا وَلَمْ تَأْكُلْ مِنْهَا، ثُمَّ قَامَتْ فَخَرَجَتْ، فَدَخَلَ النَّبِيُّ ﷺ عَلَيْنَا، فَأَخْبَرْتُهُ، فَقَالَ: ((مِنْ ابْنَتِي مِنْ هَذِهِ الْبَنَاتِ بَشِيءٌ، كُنَّ لَهُ سِتْرًا مِنَ النَّارِ)) [اخرجه البخاری: ۱۳۱۸، ومسلم: ۲۶۲۹]

”اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ ہمارے ہاں ایک سالہ عورت آئی، اس کی معیت میں اس کی دو بیٹیاں تھیں، مگر گھر میں سوائے ایک کھجور کے اور کچھ نہ تھا۔ میں نے وہی کھجور اُس کو دے دی۔ اُس عورت نے کھجور کو دو حصوں میں تقسیم کیا اور دونوں بیٹیوں میں بانٹ دیا، خود کچھ نہ کھایا۔ پھر وہ اٹھ کر چل دی۔ جب نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لائے تو میں نے سارا واقعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور عرض کر دیا۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو شخص ان بیٹیوں کے ساتھ آزمایا گیا تو یہ بیٹیاں اس کے لیے جہنم کی آگ سے آڑ بن جائیں گی۔“

شانِ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم

یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ رحمۃ للعالمین کی ایک جھلک تھی کہ دورانِ سفر اگر کسی صحابی نے ہرنی کا بچہ پکڑا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”کون ہے جس نے اس کی ماں کا دل توڑا ہے؟ اس کا بچہ واپس کر دو!“ اگر کسی نے چڑیا کے انڈے اٹھائے تو چشمانِ مبارک اشک بار ہو گئیں۔ کسی نے جانوروں کو چار اور پانی نہیں دیا تو اس کی سرزنش فرمائی۔ دنیا آج بھی جن لوگوں سے کنارہ کش ہے میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لیے بھی کشادہ دست رہتے تھے۔ ایک بڑھیا نے دورانِ محفل کا ہاتھ کا اشارہ کر کے بلایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے۔ اُس نے دستِ مبارک پکڑا اور چلنے لگی۔ وہ بڑھیا چلتی جا رہی ہے اور اپنے خاص انداز سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محو گفتگو ہے۔ میرے آقا مسکرا رہے ہیں۔ کافی وقت بیت جاتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف نہیں لاتے۔ صحابہؓ میں تشویش کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی ہوئی تو صحابہ عرض کرتے ہیں: ”ہماری جان آپ ہیں، روح کا قرار آپ ہے۔ اے رحمت حق! آپ اس عورت کے ساتھ چل پڑے جو پورے مدینہ میں مشہور ہے کہ پاگل ہے، اس کا دماغی توازن ٹھیک نہیں ہے۔“ فرمایا: ”مجھے یہ بتاؤ کیا میں اُس کا رسول نہیں ہوں؟“

کو معاف کرنا اور امان دینا ہے۔ طائف کے باسیوں کو پتھروں کے بدلے دعا دینا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا تقاضا

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور تعظیم ہر مسلمان کے دل کی اتھاہ گہرائیوں تک جاگزین ہونی چاہیے جب کہ عوام الناس کی اکثریت کا معاملہ یہ ہے کہ وہ محض عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم مناکر، جلے جلوس نکال کر، سیرت کانفرنسیں کر کے یا ذوق و شوق کے ساتھ جھوم جھوم کے نعتیں پڑھ کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے بحیثیت امتی اپنی ذمہ داری پوری کر دی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جو حقوق ہم پر عائد تھے وہ ہم نے ادا کر دیے ہیں اور اب ہماری شفاعت کی ہو گئی ہے۔ یہ جھوٹا اور خود ساختہ اطمینان ہمیں اس طرف متوجہ ہونے نہیں دیتا کہ از روئے قرآن حکیم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی حقیقی اساسات اور صحیح بنیادیں کیا ہیں!

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا ۖ الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۖ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۖ فَأَمِئْتُوا لِلَّهِ وَرَسُولِهِ ۚ النَّبِيُّ الَّاٰخِرُ الَّذِي يُوْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبَعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ﴾ (الاعراف)

”آپ کہہ دیجیے: لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا رسول ہوں جو آسمانوں اور زمین کی سلطنت کا مالک ہے۔ اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہی زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ لہذا اللہ اور اُس کے رسول نبی اُمّی پر ایمان لاؤ اور اُسی کی پیروی کرو! امید ہے کہ تم راہِ راست پالو گے۔“

اس آیت مبارکہ کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسانی معاشرے کی فوز و فلاح اور کامل ہدایت کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اتباع ناگزیر ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی صرف چند انفرادی عبادات یا ظاہری تعلق تک محدود نہیں، بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع ہی نجات کا واحد ذریعہ ہے۔ نفاذ اسلام اور اقامت دین کی جدوجہد ہر مسلمان پر عائد ہونے والی سب سے اہم اور بنیادی ذمہ داری ہے۔

اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اقامت دین

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا اصل مقصد دنیا میں باطل کے تمام نظاموں کو سرنگوں کر کے دین حق کو غالب کرنا تھا۔

﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدٰى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ﴾

(التوبة: ۳۳، الفتح: ۲۸، الصف: ۹)

”وہی ذات ہے جس نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ اس کو تمام ادیان پر غالب کر دے۔“

ہمیں یہ یاد رکھنا ہوگا کہ محض زبانی دعوئے نعت خوانی یا سالانہ محافل اقامت دین کا متبادل نہیں ہو سکتیں۔ مدینہ کی ریاست قائم کر کے عدل، انصاف اور احکام الہی کے نفاذ کا ایک عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ ہمیں سکھاتا ہے کہ معاشرے سے ظلم، ناہمواری اور باطل نظریات کے خاتمے کے لیے مسلسل کوشش اور جدوجہد ناگزیر ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ: عزّت و بقا کا ضامن

جہاد فی سبیل اللہ وہ عظیم فریضہ ہے جس کے بغیر نہ تو اقامت دین کی منزل حاصل ہو سکتی ہے اور نہ ہی اُمت کی عزّت و آبرو محفوظ رہ سکتی ہے۔ جہاد کا مقصد دنیا میں فتنہ و فساد اور ظلم کا خاتمہ کر کے اللہ کے بندوں کو اللہ کی بندگی میں لانا ہے۔ اقامت دین کی جدوجہد میں مال، وقت، صلاحیتوں اور جان کی قربانی پیش کرنا پڑتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی اس بات کی گواہ ہے کہ انہوں نے دین حق کو غالب کرنے کے لیے میدان کارزار میں سختیاں جھیلیں اور عظیم قربانیاں دیں۔ ❀❀❀

خلافت کی حقیقت، تاریخی پس منظر، عہد حاضر میں اس کا ڈھانچہ اور اس کے قیام کے نبوی طریق پر مشتمل

خلافت کی حقیقت

اور عصر حاضر میں اس کا نظام

ڈاکٹر اسرار احمد

اشاعت خاص 450 روپے، اشاعت عام 300 روپے

عظمتِ لا الہ الا اللہ

ڈاکٹر ربیعہ ابرار

اللہ خالق و مصور کی بنائی اس وسیع العریض کائنات میں اُس کی شانِ عرفی کے کئی شاہکار مختلف انداز سے انسانی عقل کو مالک کائنات کے کمال و قدرت کے آگے زیر رکھتے ہیں۔ بعض چیزیں اپنے قد و جسامت، اپنی ہیئت اور رنگ و بو سے، تو کوئی مخلوق اپنے دانش مندانہ طرزِ حیات سے ہمیں حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ اس فہرست کمالات میں ایک جہت چیزوں کا وزن بھی ہے جو بجائے خود ایک معجزہ ہے۔ اس حیرت کدہ میں جسے ہم سیارہ زمین کہتے ہیں، بھاری بھر کم ہونے کے اعتبار سے بدیع السماوات والارض کے ایسے فن پارے موجود ہیں جو اکثر عام لوگوں کی توجہ میں نہیں آتے۔

سرسری طور پر چند ایک کو دیکھیں تو امریکی ریاست Utah میں پائے جانے والا سفیدے کے درختوں کا کنج، جو بظاہر ایک جنگل نظر آتا ہے لیکن درحقیقت وہ ایک ہی جڑ سے اُگنے والا درختوں کا گروہ ہے جس کا نام پانڈو ہے۔ درختوں کے اس گروہ کو عموماً سب سے بھاری زندہ جاندار قرار دیا جاتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک درخت کا اوسط وزن چھ ہزار ٹن بتایا جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے امریکی ریاست Oregon کے ایک جنگل میں موجود پھوندی جس کو عظیم الجثہ فنگس کہا جاتا ہے، کو دنیا کا سب سے بڑا جاندار قرار دیا ہے۔ اس کے وزن کا تخمینہ تقریباً ۳۵ ہزار ٹن لگایا جاتا ہے۔

انسان کی بنائی چیزوں میں دیوار چین سب سے وزنی سمجھی جاتی ہے جس کا وزن دس کروڑ ٹن ہے۔ قدرتی اشیاء کی بات کی جائے تو پہاڑ کئی اعتبار سے ربِّ ذوالجلال کی عجب صنعت کاری کا مظہر ہیں۔ ان کے وزن کے بارے میں محض اندازہ ہی لگایا جاسکتا ہے، یقینی بات اس لیے نہیں کی جاسکتی کیونکہ ان کا زیادہ تر حصہ زمین کے اندر موجود ہوتا ہے۔ دنیا کا وزنی ترین مانا جانے والا پہاڑ ماؤنا لواو ہے۔ اس کا وزن تقریباً ۲۷۷ کھرب ٹن ہے۔ یہ اس قدر بھاری ہے

کہ سمندر کی تہ اس کے وزن کی وجہ سے آٹھ کلومیٹر نیچے دھنس گئی ہے۔ زیر زمین اسرار کی بات کریں تو ”ایل ایل ایس وی پی ایس“ بے نظیر بوبے ہیں۔ کسی براعظم کے برابر رقبہ رکھنے والے یہ دو تودے ہیں، جن میں سے ایک بحر الکاہل کے نیچے اور دوسرا افریقہ کے نیچے گہری تہوں میں موجود ہے۔ یہ زمین کے اوپر موجود سب سے اونچے پہاڑ ایوریسٹ سے کئی سو گنا اونچے ہیں اور زمین کے وزن کا تقریباً ڈیڑھ سے تین فیصد حصہ رکھتے ہیں۔ ہماری زمین کا وزن چھ ہزار کھرب ٹن سے بھی زیادہ ہے۔

ان اوزان کے مقابلے پر انسانی قدرتوں کو پرکھا جائے تو زیادہ سے زیادہ وزن جو کوئی مضبوط سے مضبوط انسان اٹھا سکتا ہے وہ ۵۰۰ سے ۶۰۰ کلو کے درمیان ہے۔ وسائل کی مدد سے تاریخ میں جو سب سے بڑا وزن ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا گیا ہے وہ ۱۲ ملین ٹن یعنی ۱۲ لاکھ ٹن ہے۔ اس ساری تمہید ان بھاری بھر کم اشیاء اور جانداروں کی تفصیل، اور ان کے آگے انسانی وزن اور قدرتوں کی کم مائیگی کا ذکر کرنے کا مقصود قاری کے سامنے ایک ایسی تصویر کھینچنا ہے جس کے بعد انسان کو خود پر ربِّ کریم کے فضل کا کسی قدر اندازہ ہو سکے۔

درج بالا تمام اعداد و شمار کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس حدیث کے متعلقہ حصے کو پڑھتے ہیں۔ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ جب اللہ کے نبی حضرت نوح علیہ السلام کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے اپنے بیٹے کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا:

((.... آمُرُكَ بِ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“، فَإِنَّ السَّمَوَاتِ السَّبْعَ وَ الْأَرْضَيْنِ السَّبْعَ، لَوْ وُضِعَتْ فِي كِفَّةٍ، وَ وُضِعَتْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ فِي كِفَّةٍ، رَجَحَتْ بِهِنَّ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَلَوْ أَنَّ السَّمَوَاتِ السَّبْعَ وَ الْأَرْضَيْنِ السَّبْعَ كُنَّ خَلْقَةً مُبْهِمَةً، فَصَمْتُهُنَّ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ..... الخ))

[سلسلة الاحاديث الصحيحة: ۳۸۳۸]

”..... میں تمہیں اس بات کا حکم دیتا ہوں کہ لا الہ الا اللہ کا اقرار کرتے رہنا، کیونکہ اگر ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کو (ترازو کے) ایک پلڑے میں رکھا جائے اور لا الہ الا اللہ کو دوسرے پلڑے میں، تو لا الہ الا اللہ والا پلڑا جھک جائے گا۔ اور اگر ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں ایک بند حلقے کی شکل اختیار کر لیں تو لا الہ الا اللہ اس کو بھی توڑ کر کھول دے گا.....“

یعنی ہماری زمین اپنے دیوبہکل پہاڑوں، گہرے سمندوں اور وسیع و عریض صحراؤں سمیت ہو پھر زمین کے گرد موجود ہوا، جو اپنا وزن اور دباؤ رکھتی ہے، پھر دیگر سیارے، ستارے سب ایک پلڑے میں ہوں جبکہ دوسرے پلڑے میں وہ ایک کلمہ جو زبان پر نہایت سہل ہے، مگر درحقیقت اس قدر جامع ہے کہ ترازو کے پلڑے کو اپنے حق میں جھکا دے۔ یہ بھی واضح رہے کہ پوری کائنات میں ہماری یہ زمین ریت کے ایک ذرے کے برابر حیثیت بھی نہیں رکھتی۔

کلمہ لا الہ الا اللہ کی عظمت کو سمجھنے کے لیے آپ بہت سی مضبوط چیزوں کو ذہن میں لاتے جائیں، پھر ساری زمینوں اور آسمانوں کو اسی کلمہ کے آگے حقیر ہوتا محسوس کریں۔ اس حدیث کی عملی صورت کو اصل شدت سے سمجھنے کے لیے اپنے گرد کسی بھی مضبوط شے پر غور کریں۔ پھر اس حقیقت کو اپنے اندر سرایت کرنے دیں کہ اگر لا الہ الا اللہ کوئی مادی وجود رکھتا تو وہ اس مضبوط چیز کو پل میں نیست کر دیتا۔ اگرچہ حدیث میں بیان کردہ حقیقت معنوی یا استعاراتی انداز میں لی جاتی ہے، لیکن اللہ عزوجل کی ہر بات ہر لحاظ سے صادق ہوتی ہے، یعنی لغوی معنی میں بھی اور استعاراتی معنی میں بھی۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آیات لغوی اور استعاراتی دونوں ہی معنوں پر صادق آتی ہیں، جیسا کہ سورۃ الحمد میں فرمایا:

﴿وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ (آیت ۲۵)

”اور ہم نے لوہے کو اتارا جس میں سخت ہیبت و قوت ہے اور لوگوں کے لیے اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔“

ایک عرصے تک علماء کرام لوہے کے اتارے جانے کو ایک شرف اور انعام کے بطور اَنزَلْنَا کے لفظ کو سمجھتے رہے۔ آج جدید سائنس اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ لوہا ہماری زمین کی پیداوار نہیں، بلکہ یہ ۵۷ء ۴۱ سال قبل زمین کی پیدائش کے وقت بھاری بھر کم ستاروں کے چھٹنے سے ہماری زمین کے مرکز میں شامل ہوا۔ زمین کی سطح پر موجود لوہا جو ہماری رسائی میں ہے، وہ بھی زمین کے وجود میں آنے کے اربوں سالوں بعد تک شہاب ثاقب اور سیارچوں کے خلا سے سطح زمین پر برستے رہنے کی وجہ سے ان ذخائر کی صورت میں جمع ہو گیا، جنہیں ہم آج کھود کر نکال لیتے ہیں۔ آج سائنسی ایجادات کی ریڑھ کی ہڈی بھی یہی لوہا ہے اور جدید ٹیکنالوجی کا ڈھانچا بھی اسی لوہے کے بل بوتے پر کھڑا ہے۔ اسی طرح سورۃ الاعلیٰ کی آیات چار اور پانچ جسے علماء متقدمین کھیتی اور سبزے کے خراب ہو جانے سے متعلق سمجھتے رہے، آج سائنس کی

دریا فتنوں کی روشنی میں وہ اسے قدرتی ذخائر کے عمل کی طرف اشارہ گردان رہے ہیں کہ کس طرح سبزہ زمین کی تہوں میں دب کر بے تحاشہ دباؤ کے تحت کالے سیال مادے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

اسی طرح لفظوں کے لغوی اور استعاراتی معنی پر پورا اترنے کی ایک خوبصورت مثال سورۃ الاحزاب میں آئی ہے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿مَا جَعَلَ اللَّهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهِۦ﴾ (آیت: ۴)

”کسی آدمی کے سینے میں اللہ تعالیٰ نے دو دل نہیں رکھے۔“

اگرچہ یہاں ظہار کے پس منظر میں بات کرتے ہوئے یہ بتایا جا رہا ہے کہ جیسے انسان کے ایک جسم میں دو دل نہیں ہو سکتے ویسے ہی بیوی کو ماں کہہ دینے سے وہ ماں نہیں بن جاتی، نہ ہی منہ بولا بیٹا زبانی بات سے سگا بیٹا بن سکتا ہے، لیکن اس آیت کو اگر لفظوں کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو واقعتاً کسی مرد کے جوف میں دو دل نہیں ہو سکتے۔ اگر یہاں رَجُل کے بجائے النَّاس کا لفظ آتا، تو پھر یہ آیت اپنے لغوی معنی میں نہیں لی جاسکتی تھی، کیونکہ النَّاس میں مرد کے ساتھ عورت بھی آ جاتی ہے، اور حمل کے دوران عورت کے جوف میں اُس کے اپنے دل کے ساتھ اُس کے جنین کا دل بھی دھڑکتا ہے۔ اسی طرح جَوْف کے بجائے صَدْر کا لفظ بھی اس آیت کے لغوی معنی کے ہم آہنگ نہ تھا۔ گویا کلام اللہ کے الفاظ کا چناؤ بھی باریک اور کامل ہے۔ حدیث میں چونکہ الفاظ رسول اللہ ﷺ کے ہوتے ہیں لیکن اس کا مفہوم اللہ کی طرف سے ہی ہوتا ہے، تو احتیاط کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اگر کوئی ترازو ایسا ہو کہ زمین و آسمان کو سانسے، تو ”لا الہ الا اللہ“ کے الفاظ اس کو مغلوب کر دیں گے۔

اس قدر روزنی، مضبوط اور ہر شے سے زیادہ اہمیت کا حامل یہ بیان ”لا الہ الا اللہ“ آخر ہے کیا؟ یہ ذکر بھی ہے، اعلان بھی ہے، شہادت بھی ہے اور طرز زندگی بھی۔ اس کلمہ کو مختلف زاویوں سے پرکھئے اور اس کی اہمیت کے اسرار کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ ذکر کے اعتبار سے بات کی جائے تو یہ افضل ذکر ہے۔ فرمان مصطفیٰ ﷺ ہے:

((أَفْضَلُ الذِّكْرِ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَ أَفْضَلُ الشُّكْرِ الْحَمْدُ لِلَّهِ))

(السلسلة الصحيحة: ۲۷۵۹)

کتنے ہی اذکار اور دعائیں ایسی ہیں جن کا آغاز لا الہ الا اللہ سے ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ماہنامہ میثاق (71) ستمبر 2026ء

جو کَلِمَاتُ الْفَرْجِ (کشادگی کے کلمات) سکھائے ہیں وہ یہ ہیں:

((لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ الْحَلِيمُ الْكَرِيمُ، لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ، لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ رَبُّ السَّمَاوَاتِ السَّبْعِ وَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ))

آیت الکرسی (البقرہ: ۲۵۵) جو اللہ رب العزت کی عظیم ترین صفات، اس کے علم اور شان کا بیان ہے، وہ بھی اللہ کا تعارف اس ہستی کے بطور کرواتا ہے جس کے سوا کوئی الہ نہیں۔ پھر آیت کریمہ جو حضرت یونس علیہ السلام کو سخت ترین آزمائش اور درد رتہ اندھیروں سے نکال لائی تھی:

﴿لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ﴾ (الانبیاء)

وہ آیت کریمہ بھی انسان کی اپنی کمزوری اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی پاکی کے بیان سے قبل یہ اقرار لاتی ہے کہ اُس کے سوا کوئی الہ نہیں۔

موت کے وقت تو اس کلمہ کا عوض جنت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ كَانَ آخِرَ كَلَامِهِ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، دَخَلَ الْجَنَّةَ)) (ابوداؤد: ۳۱۱۶)

”جس کی آخری بات لا الہ الا اللہ ہو وہ جنت میں داخل ہوگا۔“

یہ تذکرہ ہمیں ہمارے اگلے مضمون کی طرف لاتا ہے کہ اگر لا الہ الا اللہ کو دل میں مان لیا جائے اور اس کا اعلان نہ کیا جائے، تو کیا یہ کافی ہے؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔ ذرا تصور کیجیے رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اپنے قریب الموت بچا ابوطالب کے سرہانے موجود ہیں۔ عمر بھر ساتھ نبھانے والے چچا سے ان کی موت کے وقت صرف ایک تقاضا ہے کہ میرے کان میں ہی لا الہ الا اللہ کہہ دیں تو میں گواہ ہو جاؤں (صحیح البخاری: ۱۳۶۰)۔ جہاں زندگی میں یہ کلمہ ثواب کا باعث ہے، موت کے بعد عذاب سے مانع ہے اور اگلی زندگی کے لیے نجات۔

اس گواہی کو دنیاوی زندگی میں بطور اعلان لیا جائے تو اس کے کئی ایک سماجی پہلو بھی ہیں۔ یہ کسی تنہا فرد کو ایک ایسے معاشرے کی اکائی بنا دیتا ہے جس کی جان، عزت، مال کی ذمہ داری اسلامی حکومت کی ہو کرتی ہے [السلسلۃ الصحیحہ: ۹۶۷]۔ البتہ یہ جان پھر ایک امانت بھی بن جاتی ہے کہ اگر جہاد کا اعلان ہو جائے تو اسلامی مقاصد کے تحت ہونے والے قتال میں شرکت فرض عین ہو جاتی ہے۔ اس لا الہ الا اللہ کا اعلان اگر کوئی ریاست کرتی ہے، تو کئی ایک ذمہ داریاں ہیں جو اس کے ساتھ عائد ہو جاتی ہیں۔ ایسی مملکت یہ خاموش عہد کر رہی ہوتی ہے

ماہنامہ میثاق (73) ستمبر 2026ء

کہ اس زمین پر نظام صرف اللہ کا چلے گا اور قانون وہی نافذ ہوگا جو شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے۔ لوگوں کے مابین جب کبھی اختلاف ہوگا تو اسے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹایا جائے گا [النساء: ۹۵]۔ ایسی ریاست کی معیشت سود کی نجاست سے پاک ہوگی۔ اس معاشرے میں اگر کوئی عورت تنہا بھی سفر کرے تو اسے اللہ کے سوا کسی کا ڈرنہ ہوگا۔ ایک غیر مسلم ذمی امن و استحکام سے زندگی گزار سکے گا۔ افسوس کہ آج اس سارے کرۂ ارض پہ کوئی ٹکڑا زمین کا ایسا نہیں جو یہ دعویٰ کر سکے کہ وہ حقیقی معنی میں ہر اعتبار سے ایک اسلامی مملکت ہے!

آخر میں ہم بطور شہادت کلمہ توحید کو پرکھتے ہیں۔ جب کوئی شخص شہادت دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں تو وہ دین اسلام میں داخل ہو جاتا ہے، اور قانونی طور پر مسلمان کہلایا اور مانا جاتا ہے۔ وہ اگر مسلمان گھرانے میں آنکھ کھولتا ہے تو اس کا استقبال مختلف ہوتا ہے اس کی موت کی رسومات بھی دیگر ادیان سے مختلف ہوتی ہیں۔ اس کی خوشی، غمی ہر چیز کا طریقہ بدل جاتا ہے۔ اس پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ دین کی حرمتوں کا لحاظ رکھے، اس کے شعائر کا احترام کرے، اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ دین محض چند رسومات اور ادا و نواہی کا نام نہیں۔ یہ ایک گواہی ہے جس کا ادراک اگر کوئی نفس کر لے تو وہ کانپ اٹھے کہ یہ کس قدر بڑی ذمہ داری اور دعویٰ ہے۔ اسی لیے علامہ اقبال کہتے ہیں کہ۔

چو می گویم مسلمانم بلرزم

کہ دانم مشکلات لا الہ را!

”جب میں کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو میں کانپ جاتا ہوں، کیونکہ میں لا الہ الا اللہ

(توحید) کی مشکلات اور تقاضوں کو جانتا ہوں۔“

دراصل یہ گواہی کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں، اس عہد الست کی تجدید ہے کہ جب تمام بنی نوع آدم نے یہ اقرار کیا تھا کہ ان کا رب خالق، مالک، مربی صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہے۔ وہاں تو سب نے یک زبان ہو کر اقرار کر لیا تھا لیکن دنیا میں اس کی تجدید وہی کرتے ہیں جن کو توفیق نصیب ہوتی ہے۔ اس شہادت کے حامل لوگوں پر بسا اوقات یہ دنیا تنگ کر دی جاتی ہے۔ یہ دنیا یوں بھی مومن کے لیے قید خانہ ہے مگر کوئی مسلمان شریعت کی عائد کردہ پابندیوں کا پاس نہ بھی رکھتا ہو، تو بھی محض اس کا کلمہ گو ہونا اس کے لیے آزمائش کا سبب بن جاتا ہے۔ آزمائش کتنی ہی بڑی

ماہنامہ میثاق (74) ستمبر 2026ء

کیوں نہ ہو اصل حقیقت یاد رکھنے والی یہ ہے کہ رائی کے دانے برابر ایمان بھی انسان کو بالآخر دائمی جنتوں میں لے جائے گا۔ اس کے برعکس کافر زمین کے برابر وزن سونا بھی پیش کرے گا تو اپنی گردن نہ چھڑا سکے گا۔ حدیث مبارکہ میں روز قیامت کے ایک منظر کی جھلک یوں دکھائی گئی ہے:

((.....وَيُؤْتِي بِالزَّجَلِ مِنْ أَهْلِ النَّارِ فَيَقُولُ لَهُ: يَا ابْنَ آدَمَ كَيْفَ وَ جَذْتُ مَزْلَكًا؟ فَيَقُولُ أَيُّ رَبِّ شَرُّ مَزْلُ، فَيَقُولُ لَهُ: أَتَفْتَدِي مِنْهُ بِطِلَاحِ الْأَرْضِ ذَهَبًا؟ فَيَقُولُ: أَيُّ رَبِّ نَعَمْ، فَيَقُولُ: كَذَبْتَ، قَدْ سَأَلْتُكَ أَقَلَّ مِنْ ذَلِكَ وَ أَيْسَرَ فَلَمْ تَفْعَلْ فَيَزِدُّ إِلَى النَّارِ)) [السلسلة الصحيحة: ۱۵۱۸]

”..... ایک جہنمی کو لایا جائے گا اللہ تعالیٰ اس سے کہے گا: اے ابن آدم! تم نے اپنا ٹھکانا کیسا پایا؟ وہ کہے گا: اے میرے رب! بدترین ٹھکانا ہے۔ (رب عز وجل) اس سے فرمائے گا: کیا تم اس سے چھٹکارا پانے کے لیے زمین بھر سونا بدلے میں دے دو گے؟ وہ کہے گا: جی ہاں اے میرے رب۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو جھوٹ بولتا ہے۔ میں نے تم سے اس سے بھی کم اور آسان بات کا مطالبہ کیا تھا لیکن تو نے وہ مطالبہ پورا نہیں کیا۔ پھر

اسے آگ میں واپس ڈال دیا جائے گا۔“

”أَقَلَّ مِنْ ذَلِكَ وَ أَيْسَرَ“ کا معنی یہاں اقرار لا الہ الا اللہ ہی تو ہے۔ انسان سے تو بس اتنا سا تقاضا تھا کہ وہ اپنی فطرت سے ہم آہنگ ہو جائے اور اس کائنات کے سب سے بڑے سچ کو تسلیم کر لے۔ یہ اقرار کر لے کہ کوئی خدا نہیں، کوئی الہ، معبود نہیں، کوئی پالنہ نہیں، کوئی اُن داتا نہیں، سوائے اللہ عز وجل کی ذاتِ مبارکہ کے۔

لا الہ الا اللہ کا زبانی اقرار اگر کامیابی کے لیے ناگزیر ہے تو اس کا قلبی یقین انسان کے لیے ایک الگ ہی سمت کا راستہ آشکار کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا نورِ بصیرت ساتھ لاتا ہے کہ انسان کا طرز زندگی ہی بدل جاتا ہے۔ لا الہ الا اللہ کا علم بردار پھر شتر بے مہار والی زندگی نہیں گزار سکتا۔ اس کی زندگی ایک اعلیٰ ضابطے کی پابند ہوتی ہے، جس کے فیصلے بھی بہت سی باتوں کو ملحوظ رکھ کر ہوا کرتے ہیں۔ بظاہر یہ اصول پابندیاں، روک ٹوک قید معلوم ہوتے ہیں، لیکن درحقیقت یہ انسان کو غلامی کی بہت سی صورتوں سے بچا لیتے ہیں۔ ایک خالق کے آگے جبین خاک آلود کرنے والا دَر دَر سر جھکانے سے بچ جاتا ہے۔ وہ ہاتھ جو المٹان کی بارگاہ میں اٹھتے ہیں، پھر کسی اور کے سامنے سوالی بن کر دراز نہیں ہوتے۔ یہ ایک ایسی خلاصی ہے جس کی قدر اسی شخص کو ہو سکتی ہے

جس نے زندگی بہت سے شکنجوں میں گزاری ہو۔ معاشرتی اقدار کی قید، لوگوں کی تنقید کی فکر، گھر والوں کی توقعات کا بوجھ رشتہ داروں کی رضامندی کا طوق، ہم عمروں کا دباؤ، ان سب بندشوں سے آزاد ہو کر انسان صرف ایک رب کا غلام بن جاتا ہے۔ بقول علامہ اقبال ۔

یہ ایک سجدہ جسے تُو گراں سمجھتا ہے

ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات!

یہ دنیا انسان کو ضرورتوں سے عاجز رکھتی ہے، چاہتوں میں الجھاتی ہے، اپنے مکر و فریب کو خوبصورت بہلاؤں کی شکل میں مزین کر کے لاتی ہے اور پھر اونچی لہروں کی شکل میں محصور زدہ ناظرین کو اچک کر لے جاتی ہے۔ انسان ان خواہشات کے حصول کے لیے جانے انجانے کس کس دَر پر جھک جاتا ہے۔ ایسے میں کلمہ توحید ایک مضبوط سہارا ہے، جو نہ صرف انسان کے قدموں کو تھام لیتا ہے بلکہ اس کے دل میں بھی کسی باطل معبود کی محبت کو سرایت ہونے سے روک رکھتا ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْدَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ وَالَّذِينَ

أَمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ﴾ (البقرة: ۱۶۵)

”اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کو چھوڑ کر کچھ اور چیزوں کو اُس کا ہمسرا اور بد مقابل بنادیتے ہیں، وہ ان سے ایسی محبت کرنے لگتے ہیں جیسی اللہ سے کرنی چاہیے۔ اور جو لوگ واقعی صاحبِ ایمان ہوتے ہیں ان کی شدید ترین محبت اللہ کے ساتھ ہوتی ہے۔“

اسی طرح یہ کسی رہبر کی صورت انسان کو ناامیدی کے صحراؤں میں بھٹکنے سے بچاتا ہے۔ جو انسان اپنی شہ رگ سے بھی قریب اپنے رب کو نہیں پہچانتا، اس کی بتائی نصیحت سے فائدہ نہیں اٹھاتا، اسے ہر سمت سے شیاطین آواز دیتے ہیں۔ وہ آوازیں اسے ایسے راستوں پر لے جاتی ہیں جو گرہی اور ہلاکت کے ہوتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ أَتَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلَى أَعْقَابِنَا بَعْدَ إِذْ

هَدَيْنَا اللَّهُ كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيَاطِينُ فِي الْأَرْضِ حَيْرَانٌ ۚ إِنَّ أَصْحَابَ يَدْعُوْنَهُ

إِلَى الْهُدَى الْاِْتِنَاءُ قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَى ۚ وَأَمْرًا لِنُسَلِّمَهُ لِرَبِّ

الْعَالَمِينَ﴾ (الانعام)

” (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! ان سے) کہیے: کیا ہم پکاریں اللہ کو چھوڑ کر اُن چیزوں کو جو ہمیں نفع پہنچا سکتی ہیں نہ نقصان؟ اور ہم اپنی ایڑیوں کے بل لوٹا دیے جائیں اس کے بعد کہ اللہ نے ہمیں ہدایت دے دی ہے اُس شخص کی مانند جسے شیاطین نے بیابان میں بھٹکا کر حیران و سرگرداں چھوڑ دیا ہو؟ اُس کے ساتھی اُس کو سیدھے راستے کی طرف پکار رہے ہوں کہ آؤ ہماری طرف! کہہ دیجیے: یقیناً اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے اور ہمیں تو حکم ہوا ہے کہ ہم تمام جہانوں کے پروردگار کی فرماں برداری اختیار کریں۔“

کہا جاتا ہے کہ جب عرب رات میں صحراؤں کا سفر کیا کرتے تھے تو جنّات انہیں آوازیں دے کر بھٹکا دیتے تھے۔ جنّات کی اکثریت بنی آدم کی مخلص نہیں لہذا یہاں ان کی شرارت کا پتہ چلتا ہے کہ کس طرح وہ انسانوں کو دھوکا دیتے تھے۔ اللہ عزوجل نے اس آیت کے آغاز میں صحرا میں بھٹکنے کے عمل کو غیر اللہ کو پکارنے کے مترادف قرار دیا ہے۔ کسی ایسی ہستی سے جو نہ کسی نفع کی مالک ہو سکے نہ نقصان کی آسیرے وابستہ کرنا صحرا میں بھٹک جانے کی مانند ہی تو ہے۔ چونکہ کلمہ توحید کو روح بشر میں راسخ کرنے کے ساتھ اسے انسانی عقل سے منوانا بھی مقصود تھا چنانچہ اللہ عزوجل قرآن کریم میں پھیر پھیر کر مثالیں بیان فرماتے ہیں۔ قرآن کا ایک تہائی حصہ اللہ کی وحدانیت پر محیط ہے۔ اس میں جا بجا اللہ تعالیٰ کے بلا شرکت غیرے اکیلے الہ ہونے کا بیان ہے:

﴿اِنَّهُ لَا اِلَهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ (البقرة: ۲۵۵ و آل عمران: ۲)

”اللہ وہ معبود برحق ہے جس کے سوا کوئی الہ نہیں۔ وہ زندہ ہے سب کا قائم رکھنے والا ہے۔“

﴿اِنَّمَا اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِي لَا اِلَهَ اِلَّا هُوَ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا﴾ (طہ)

”حقیقت میں تمہارا معبود تو صرف اللہ ہے جس کے سوا کوئی اور معبود ہے ہی نہیں۔ اُسے ہر چیز کا علم حاصل ہے۔“

بعض مقامات پر اس توثیقی انداز کے برعکس کسی دوسرے معبود کی نفی کے دلائل لا کر انسانی عقل کو توحید تسلیم کرنے پر جھنجھوڑا گیا ہے۔ مثلاً ایک بہت خوب صورت مثال سورۃ القصص کی آیت ۷۱ اور ۷۲ میں دی گئی ہے۔ ہمارے روز کے مشاہدے اور تجربے کی چیز ہماری زندگی کا اہم جزو یعنی ہمارے دن رات کا ایک دوسرے کے پیچھے بنا کسی رخنے کے غیر محسوس انداز میں آنا جانا فرمایا کہ اگر یہ دن کبھی طلوع ہونے سے انکاری ہو جائے اور بیشکی کی رات قیامت

تک کے لیے چھا جائے تو کیا پھر تم کسی ایسے معبود کو جانتے ہو جو تمہارے لیے دن کی روشنی اس کی حرارت اس کی چہل پہل لے آئے گا! تمہارے کام کا روبرو عظیم منصوبے پودوں کا آکسیجن تیار کرنا سورج کا سمندر کے پانی کو بادل کی شکل تک لانے کا پورا مرحلہ یہ سب کوئی دوسرا تمہارے لیے کر سکتا ہے؟ یا پھر اس کے برعکس اگر قیامت تک کے لیے اتنے فوائد سے بھرا یہ دن تم پر طاری کر دیا جائے تو پھر تم آرام کیسے کرو گے؟ رات کے سکون کو کیسے پاؤ گے؟ اس کے اندھیرے اور خاموشی کی تسکین کہاں ڈھونڈو گے؟ اگر تم کوئی دوسری ایسی ہستی پاتے ہو جو اسی ربط اور بے مشقت انداز میں دن رات کے نظام کو چلانے پر قادر ہے تو پھر ٹھیک ہے وہ ہستی الہ کہلانے کی بھی حق دار ہو سکتی ہے۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے دن رات کی بیشکی کی جو بات کی ہے اس کی ایک جھلک ہمیں اسی دنیا میں دکھادی ہے۔ کرۃ الارض کے قطب جنوبی اور شمالی پر چھ ماہ کا مستقل دن رہتا ہے جس میں سورج نہیں ڈوبتا اور تقریباً چھ ماہ کی رات رہتی ہے جس میں مستقل تاریکی چھائی رہتی ہے۔ آج سائنس قدرتی نظام کو بدلنے اور انسانی آرام کے لیے ہر طرح کی سعی کرنے میں مصروف ہے لیکن وہ ان جگہوں پر معمول کے دن رات لانے سے قاصر ہے۔

اسی طرح سورۃ النمل کی آیات ۶۰ تا ۶۴ میں اللہ تعالیٰ اپنی اور بھی کئی نشانیوں کا ذکر فرماتے ہیں جو اُس کے الہ واحد ہونے پر دلالت کرتے ہوئے انسانی سوچ کو دعوتِ فکر دیتی ہیں کہ وہ اپنے شعور کی بنا پر شرک سے باز آجائے۔ فرمان باری تعالیٰ کا مفہوم ہے کہ آسمان وزمین کا خالق کون ہے اور آسمان سے بارش برسانے والا کون ہے! آج سائنس دان مصنوعی بارش برسانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ یہ بقدر مشقت اور بہت سے وسائل کے بعد ہی کر پاتے ہیں۔ وہ نئے بادل بنانے سے عاجز ہیں اسی لیے آسمان پر پہلے سے موجود نمی بھرے بادلوں پر انحصار کرتے ہیں۔ اس سب کے باوجود بھی مصنوعی بارش نقصان سے خالی نہیں اور ماحولیاتی نظام کو درہم برہم کر سکتی ہے اس کے برعکس اللہ سبحانہ و تعالیٰ جو بارش برساتے ہیں وہ بیج سے درخت اور ہریالی نکالتی ہے جو دوسرا کوئی نہیں نکال سکتا۔ تخم ریزی کی بنیاد تین چیزوں پر ہے: پانی، مناسب موسم اور آکسیجن۔ اس سب کے ساتھ کچھ اور بھی ہے جو اگر ساتھ نہ دے تو اس بیج کو اُگنا نصیب نہیں ہوتا۔ سائنس اسے خامروں (Enzymes) کا بیدار ہونا اور hormones کا ماہنامہ میثاق (77) ستمبر 2026ء

توازن کہتی ہے۔ درحقیقت وہ رب تعالیٰ کا اذن ہے اس کا کلمہ کُن ہے۔ جب وہ حکم دیتا ہے تو مردہ (بج) سے زندہ (پودا) نکل آتا ہے۔

آیت ۶۱ میں اللہ تعالیٰ اپنی صنعت کی بلند پایہ تخلیقات کا ذکر فرماتے ہیں کہ کس طرح سولہ سو کلو میٹر فی گھنٹہ اپنے محور پر اور ایک لاکھ سات ہزار کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے سورج کے گرد گھومنے والی زمین کو انسانی زندگی کے لیے قرار گاہ بنایا گیا ہے۔ یہی نہیں کہ یہ حرکت میں ہے بلکہ اپنی ساخت کہ اعتبار سے بھی یہ کوئی جامد تختہ نہیں بلکہ اس کی ارضیاتی تختیاں (Tectonic plates) پچھلے ہوئے (نیم مائع) غلاف ارض (Mantle) پر مسلسل اپنی جگہ بدل رہی ہیں۔ اس سب کے باوجود کشش ثقل، کرہ ہوائی کے دباؤ اور قشر ارض (Crust of the earth) کے غیر معمولی توازن کے باعث یہ انسانی زندگی کے لیے ایک مثالی اور مکمل طور پر مستحکم گہوارہ بنی ہوئی ہے۔ اس زمین کا بنجرین دور کرنے کے لیے اس پر پانی کو یونہی نہیں چھوڑ دیا گیا، بلکہ دریا مستقل کناؤ کا عمل کرتے، مٹی کو بہا لے جاتے، اور ارضیاتی پلٹیوں کی قدرتی دراڑوں (fault lines) وادیوں اور ساختی شگافوں کا رخ اختیار کرتے ہیں۔ وہ ایک ایسا پیچیدہ اور باہم جڑا ہوا نظام بناتے ہیں جو میٹھے پانی کی تقسیم کے لیے زمین کے خد و خال (topography) کے اندر رچ بس جاتا ہے۔

دریاؤں کے ذکر کے بعد ان کے عمومی مولد یعنی پہاڑوں کی بات کی۔ بلندی پر برسنے والی بارش اور گلیشیرز سے پگھلنے والی برف کا پانی جہاں دریاؤں کے نظام کو وجود دیتا ہے وہیں پہاڑوں کا ایک بڑا مقصد و مصرف یہ ہے کہ وہ زمین کے توازن (isostasy) کو برقرار رکھنے کے لیے میخوں کا کام کرتے ہیں۔ یہ مستقل متحرک ارضیاتی تختیوں کو استحکام بخشتے ہیں، زمین کی اندرونی کشیدگی کو اپنے اندر جذب کرتے ہیں اور زمین کی تیز رفتار گردش کے دوران پتلی قشر ارض (کرسٹل پلیٹس) کو شدید لرزش یا پھسلنے سے محفوظ رکھتے ہیں۔ ایک جانب اُس ذات مبارکہ نے ہماری زمین کو دیوبہکل پہاڑوں کے اسباب سے ٹھہرا کر ہمیں دکھایا ہے، تو دوسری طرف سمندروں کو تو اُس نے نظر نہ آنے والی ایک آڑ کے ذریعے ملنے سے روک رکھا ہے۔ جب کسی مقام پر کھارے اور میٹھے پانی کے اجسام ملتے ہیں تو نمکیات (شورہ پن) درجہ حرارت اور پانی کی کثافت میں فرق کے باعث ان کے درمیان ایک طبعی سطحی تناؤ کی رکاوٹ قائم ہو جاتی

ہے۔ اس طرح وہ دو سمندر ساتھ چلتے ہوئے بھی اپنی اپنی صفات، نمکیات کی مقدار اور آبی زندگی کو برقرار رکھتے ہیں۔ یہی معاملہ دہانہ پر ہوتا ہے۔ جب دریا سمندر میں گرتے ہیں، تو نمکیات کا یہی فرق سمندر کے کھارے پانی کو دریا کے میٹھے پانی میں ملنے سے بچاتا ہے۔ وہ اللہ ہی ہے جس کی بنائی تصویر اس قدر باریک مگر جامع نظام اور اصولوں پر کھڑی ہے۔ اگر کوئی دوسرا الہ ہے جو اس طرح کے متوازن نظام بنا اور چلا سکتا ہے تو پھر وہ عبادت کے بھی لائق ہے!

کائناتی نشانیوں کے بعد انسان کو اس کے اپنے نفس کے روبرو کرایا (آیت ۶۲) کہ کون ہے جو تمہارے دل کو تم سے بھی بہتر جانتا ہے۔ جو دل مضطرب کی پکار سنتا ہے، جو مانگا جائے وہ عطا کرتا ہے اور اس نعمتوں بھری دنیا میں تمہیں تمہاری زندگی کا وقتی مختار بنا دیتا ہے۔ وہی تمہیں نسل و نسل یہاں بٹا رہا ہے۔ ذرا نصیحت تو پکڑو! یہ باطل سہارے بہلا داتا ہو سکتے ہیں، کھوکھلا دلا سا بھی ہو سکتے ہیں، لیکن ان میں کشف کی قدرت نہیں کہ تمہاری بندگروں کو کھول دیں، تمہاری بے قرار یوں پر مرہم رکھ دیں۔ تمہاری آرزوؤں کا ثمر صرف ایک اللہ ہی دے سکتا ہے جو عجیب الدعوات اور کاشف السوء ہے۔ وہ لوگوں کو ان کی ذلت اور پستی کے بعد پھر کھڑا کرتا ہے، ان کو ایک حالت سے دوسری پر لے آتا ہے، ان کی امیدوں کی لاج رکھتا ہے۔ یہ سب اختیار صرف اللہ ہی کا ہے اور اسی کی رحمت کے شایاں ہے۔

مزید فرمایا (آیت ۶۳) کہ وہ ہادی و مرشد صرف دل کو راستے نہیں دکھاتا، بلکہ تمہیں تمہارے زمینی اور بحری سفروں میں باوجود اندھیروں کے صحیح منزل پر لے آتا ہے۔ آج بھی لوگ اس امر کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ نئی ٹیکنالوجی اور جی پی ایس کے باوجود وہ بھٹک جاتے ہیں۔ یا اگر یہ سائنسی ذرائع کسی جگہ مہیا نہیں ہوتے ہیں، وہاں کسی غیبی مدد کے ذریعے، یا کبھی باطن میں الہام ہونے والے اشاروں کی مدد سے انسان کسی بڑے مشکل سفر سے خیریت کے ساتھ پار اتر جاتا ہے، تب اس کا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ اللہ کے خاص کرم ہی سے ممکن ہو پایا ہے۔ اس کی رحمت کا ایک اور انداز بارش سے قبل چلنے والی ہوا ہے، جو مٹی کی سوندی خوشبو کے ساتھ اللہ کی رحمت کی اطلاع بھی لے آتی ہے۔ مصنوعی بارش میں اوزون پیدا نہیں ہوتی، لہذا اس کی میٹھی خوشبو بھی نہیں ہوتی۔ جب ایسی چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی کوئی نقل نہیں کر سکتا تو اللہ کے ساتھ کسی کے الہ نہ ہونے کا کیا شک رہ جاتا ہے! وہی اکیلا ہوا بادلوں اور بارشوں کا مالک ہے اور اسی کے

کیے گئے کاموں میں خیر اور رحمت ہے۔

ان آیات کی تکمیل (آیت ۶۴) اس شان سے فرمائی کہ اللہ تو وہ ہے جو عدم سے تخلیق کی ابتدا کرتا ہے۔ کسی خام مال، کسی پلان یا فارمولے کے تحت کوئی چیز بنانے والا تو موجود نہ ہوا، وہ تو نقال ہوا۔ اللہ ہی نے تخلیق کا آغاز فرمایا، اس کا رزق اسے بہم پہنچایا اور پھر وہی اس کا اعادہ فرمائے گا۔ غور طلب بات تو یہی ہے کہ جب کوئی عقلی دلیل اللہ کے سوا کسی خالق کو نہیں پاتی تو پھر لوگ کیوں کر لا الہ الا اللہ کا اقرار نہیں کر لیتے؟ اس قدر دلائل اور مختلف مثالوں کے باوجود نہ ماننے والے کے لیے دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿قُلْ اَرَاَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰی قُلُوْبِكُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَيْرِ اللّٰهِ يَاتِيَنَّكُمْ بِہٖۡ اَنْظُرْ کَیْفَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ ثُمَّ هُمْ یَصِدُّوْنَ ﴿۱۰﴾﴾ (الانعام)

”(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! ان سے) پوچھئے! کیا تم نے کبھی غور کیا کہ اگر اللہ تمہاری آنکھیں اور تمہارے کان چھین لے اور تمہارے دلوں پر مہر کر دے تو اللہ کے سوا کون سا معبود ہے جو دوبارہ تمہیں یہ (ساری صلاحیتیں) دلانے کا؟ دیکھئے ہم کس طرح ان کے لیے اپنی آیات مختلف پہلوؤں سے پیش کرتے ہیں، پھر بھی وہ کنارہ کشی کرتے ہیں!“

قصہ مختصر، سچ یہی ہے کہ اس کائنات کی تخلیق، انسان کا اپنا وجود اور ہر منطق اسی ایک نقطے پر آکر مرکوز ہے کہ لا الہ الا اللہ۔ یہی سبب ہے کہ جب رات کے اندھیرے میں سفر کرتے، اپنے جلیل القدر پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ عز وجل وادی مقدس میں لاتے ہیں اور انہیں خود سے متعارف کراتے ہیں تو ان الفاظ کے ساتھ کہ:

﴿اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدْنِیْ﴾ (طہ: ۱۴)

”یقیناً میں ہی اللہ ہوں! کوئی اور معبود نہیں سوائے میرے، پس تم میری ہی بندگی کرو۔“

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی بشریت کا اعلان کرتے ہوئے یہ بتائیں کہ میں تمہارے جیسا انسان تو ہوں، لیکن میرے منصب رسالت کی بنا پر مجھ پر جو وحی آتی ہے اس کا نچوڑ یہی ہے کہ تمہارا ایک ہی الہ ہے:

﴿قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا نَبِیٌّۭ وَرَسُولٌۭ مُّثْلُکُمْ یُوحٰی اِلَیَّ اَنْمَآۤ اِلٰہُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌۭ﴾ (الکہف: ۱۱۰)

”(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم!) آپ کہہ دیجیے کہ میں تو بس تمہاری ہی طرح کا ایک انسان ہوں“

مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود بس ایک ہی معبود ہے۔“

ایک دوسری جگہ حکم دیا کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اعلان فرمادیں سب انسانوں سے، کہ میں تم سب کے لیے اس مالک ارض و سماء کی طرف سے رسول بن کر آیا ہوں جس کے سوا کوئی الہ نہیں۔ ہر نبی کی بنیادی دعوت اور پکار بھی یہی کلمہ تو حیدر رہا ہے۔ جب کسی نبی نے اپنی قوم کو اللہ کا تعارف کرایا، تو یہی بتایا کہ وہی عبادت کے لائق ہے کیونکہ اس کے سوا تمہارا کوئی دوسرا الہ نہیں۔ سورۃ الاعراف میں حضرت شعیب، حضرت صالح، حضرت ہود، حضرت نوح علیہم السلام سب کی تبلیغ کا یہی انداز بتایا گیا ہے۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں تو خود اللہ کی گواہی ہے کہ وہ تو حید کی اعلیٰ معراج پر قائم تھے اس لیے کہ وہ ایسے وقت میں یکسو اور حنیف تھے کہ جب ساری دنیا میں کوئی دوسرا مسلمان نہ تھا۔ جب تمام عالم شرک میں ڈوبا ہوا تھا تو وہ تنہا ہی ایک اُمت تھے جنہوں نے اپنا رخ صرف ایک الہ کی طرف کر رکھا تھا، وہی جو تمام عبادتوں کے بھی لائق ہے اور تمام محبتوں اور امیدوں کا سزاوار بھی!

”لا الہ الا اللہ“ اپنے اندر ایک پوری دنیا سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ الفاظ کلمہ اخلاص ہیں، یعنی جب انسان واقعتاً دل سے یہ گواہی دے دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں، تو وہ تسلیم کر رہا ہوتا ہے کہ صرف میری عبادتوں ہی کا نہیں، بلکہ میری محبتوں، میری مقصدیت، عقیدہ، حاجتوں، چہنچہنے مرنے کا مقصد، سبھی ایک ہی رب کے گرد گھومتا ہے۔ اس کی ساری زندگی، کوششیں، جدوجہد یکسو ہو کر ایک ہی مرکز، ایک نقطہ پر سمٹ آتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کو اسی جہت میں لے کر آگے بڑھتا ہے، یعنی رب کی رضا اور محبت کا حصول۔ پھر یہ کلمہ اخلاص اس لیے بھی ہے کہ اگر کوئی شخص مستقل بھی اس کا ورد کر رہا ہو، تو بنا ہونٹوں کو ہلانے، زبان سے ادا کرتا رہتا ہے اور برابر میں بیٹھا شخص یہ جان بھی نہیں سکتا کہ اس کا ساتھی افضل الذکر میں مشغول ہے۔ اس طرح اس کا یہ عمل ریاکاری کے شبہ سے بھی پاک ہو گیا۔ پھر صحیح معنوں میں زبان کو ذکر سے تر رکھنے کا فارمولہ بھی یہ لا الہ الا اللہ ہی ہے۔ یہ چند اسباب ہیں جو اس ذکر اور کلمے کو ایمان کا افضل ترین درجہ بناتے ہیں۔ (ابوداؤد: ۶: ۴۶۷) باقی اس کے کامل کمال کی معرفت تو صرف اللہ ہی کی ذات کو ہوسکتی ہے۔ اللہ عز وجل سے دعا ہے کہ وہ اس کلمہ تجت کو ہمارا آخری کلام بنائیں تاکہ ہم اپنے رب کے وعدے، اس کی رحمت کے مستحق ہو سکیں۔ آمین!



مکہ معاہدہ

ایوب بیگ مرزا

پاکستان، سعودی عرب اور ترکیہ کے درمیان جو دفاعی معاہدہ ہوا ہے اس کی ظاہری شکل سے کون کافر ہوگا جو مطمئن اور خوش نہیں ہوگا! ظاہری طور پر تو یہ ہر لمحہ مانگنے والی ان دعاؤں کا نتیجہ ہے یا نتیجہ کا آغاز ہے کہ یارب کفر ملت واحدہ کی صورت میں متحد ہے، امت مسلمہ کو بھی متحد ہونے کی توفیق دے۔ معاہدہ کا مکہ مکرمہ میں ہونا تو سونے پر سہاگا ہے۔ اللہ کے گھر کا تقدس بھی شامل ہو گیا، اللہ تعالیٰ نیتیں بھی پاک کرے۔ آمین! اگر یہ اتحاد امت کے حوالے سے بارش کے پہلے قطرے کی مانند ہے تو ہر مسلمان کو سجدہ شکر بجالانا ہوگا۔ البتہ مسلمانوں کو صرف اس کا ظاہری نہیں دیکھنا بلکہ چند سوالات کے جواب بھی تلاش کرنے ہیں۔

پہلا سوال یہ ہے کہ کیا یہ معاہدہ علامہ اقبال کے اس خواب کی تعبیر کی طرف پہلا قدم ہے جسے انہوں نے اس مصرعے میں بیان کیا تھا: ع ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے؛ یعنی کیا یہ معاہدہ امت کے مفادات کو بحیثیت مجموعی مد نظر رکھتے ہوئے کیا گیا ہے یا کسی نے یا ان تینوں نے اپنے اپنے ملک کی ضرورت اور ذاتی اقتدار کے تحفظ کے لیے یہ دفاعی معاہدہ کیا ہے؟ راقم کے نزدیک اس معاہدے سے کوئی اپنے اقتدار کا تحفظ حاصل کر رہا ہے جبکہ کوئی معاشی لحاظ سے ضرورت مند ہے اور تحفظ کے بدلے میں اپنی غربت دور کرنا چاہتا ہے۔ اگر خالصتاً امت کا مفاد مقصود ہوتا تو پانچ یا چھ سال پہلے ایسے ہی ایک معاہدے کی تجویز پر ولی عہد سیخ پانہ ہوتے۔ پاکستان کے اس وقت کے وزیر اعظم سے دوران سفر اپنا طیارہ چھین لیا تھا۔ وہ کسی دوسرے ملک کے ہوائی اڈے پر اترنے پر مجبور ہو گئے تھے اور بعد ازاں ایک عام پرواز کے ذریعے پاکستان پہنچے۔ پھر یہ کہ پاکستانیوں کو ڈی پورٹ کرنے کی دھمکی بھی دی گئی تھی۔ درحقیقت بات دُور بینی اور ویژن کی ہے۔ کوئی اس وقت بھی ان حالات کو دیکھ رہا تھا۔ آج وہی کام کر کے ”مبارک مبارک“

کی صدائیں لگائی جا رہی ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے: ”ہر چہ دانا کند، کند نادان — لیک بعد از خرابی بسیار“ یعنی جو کام عقل مند آدمی کرتا ہے وہی بالآخر نادان بھی کرتا ہے لیکن بڑا نقصان اٹھانے کے بعد۔ ایک انتہائی اہم بات جو مال دار ریاستوں کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے وہ یہ ہے کہ تحفظ اور سالمیت خریدے نہیں جاسکتے۔ امریکہ سے زیادہ طاقتور کون تھا؟ یا سمجھا جاتا تھا؟ عربوں نے امریکہ کو مال دے کر اپنی سلامتی خریدنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ملی۔ بہر حال یہ سبق اب خلیجی ریاستوں نے سیکھ لیا ہے۔ امریکہ کے حوالے سے یہ بھی حقائق ہیں کہ وہ سات سمندر پار ہے، اتنی دور سے مدد کرنا آسان نہیں اور پھر یہ کہ وہ ایک غیر مسلم ریاست ہے۔ جبکہ اس نے دوسری طرف اسرائیل کے تحفظ کی بھی قسم اٹھائی ہوئی ہے۔ پانچ چھ سال پہلے کا واقعہ تو بطور جملہ معترضہ آگیا تھا، اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ مکہ معاہدے کو اچھی طرح چھان بھٹک کر اس کا پوسٹ مارٹم کیا جائے تاکہ اصل صورت حال سامنے آئے۔

اسلام تو مسلمانوں کو ملت واحدہ کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ لہذا خلافت کا نظام دیا گیا ہے جس میں اگرچہ مرکزیت ہے لیکن مختلف علاقوں میں گورنر متعین ہوتے ہیں۔ وہ شریعت کی بالادستی کو قائم رکھتے ہوئے خلیفہ کے حکم کے پابند ہوتے ہیں۔ خلیفہ کے پاس گورنروں کی تعیناتی اور برطرفی کا مکمل اختیار ہوتا ہے۔ وہ ایک روحانی سربراہ بھی ہوتا تھا۔ مرکزی مسجد میں نماز کی امامت خلیفہ وقت کرتا تھا جبکہ انتظامی معاملات کے حوالے سے بھی اس کا حکم آخری ہوتا تھا۔ بگاڑ کا آغاز اُس وقت ہوا جب خلافت ملوکیت میں تبدیل ہو گئی۔ اب خلیفہ کے تقرر میں عام مسلمانوں کا کوئی کردار نہ رہا۔ شان و شوکت اور تمکنت حکمرانوں کا طرز امتیاز بن گئی۔ عوام کی بہبود اور تحفظ طبقہ اشرافیہ کا مسئلہ نہ رہا۔

ایک تاثر یہ قائم ہوا کہ یہ معاہدہ درحقیقت امریکہ نے کروایا ہے جس کا اصل مقصد ایران کی مخالفت ہے۔ صدر ٹرمپ نے اس معاہدے پر ایک ٹویٹ کے ذریعے خوشی کا اظہار کر دیا اور فوری طور پر ایران کی طرف سے بھی ناپسندیدگی کا اظہار سامنے آیا۔ بعض مبصرین کی رائے ہے کہ ٹرمپ کا اظہار خوشی منافقانہ ہے۔ مسلمانوں کے کسی اتحاد پر ٹرمپ کو بھلا کیوں خوشی ہوگی! راقم کی رائے میں اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے کہ امریکہ اس معاہدے کو خوب اچھالے گا اور اپنی سربراہی میں یورپ کے مسلمانوں کے خلاف لڑنے کا جواز بنائے گا۔ گویا وہ اس کو صلیبی ماہنامہ میثاق (84) ستمبر 2026ء

جنگ کی شکل دینے کی کوشش کرے گا۔ واللہ اعلم! ایران کے بارے میں راقم کی رائے یہ ہے کہ جتنے زبردست وہ جنگجو ثابت ہوئے ہیں اس سے کہیں زیادہ وہ سفارت کاری کے ماہر ہیں۔ اس کا اقرار تو صدر ٹرمپ جیسے دشمن نے بھی کیا ہے کہ ایرانی بڑے ماہر سفارت کار ہیں۔ ایران نے آغاز میں مکہ دفاعی معاہدے کی مخالفت کی، لیکن بعد میں ترک کر دی۔ حوثیوں کی صورت میں اس کی proxy سعودی عرب پر بدستور حملے کر رہی ہے۔

یہ معاہدہ اس لیے بھی محلِ نظر ہے کہ مسلمانوں کا نظامِ خلافت ختم ہو چکا ہے۔ اب مسلمان قومی ریاستیں ہیں جن میں وہ اپنے سیاسی، جغرافیائی اور معاشی حالات کو مدِ نظر رکھ کر پالیسیاں بناتے ہیں۔ بعض مسلم ممالک اب بھی امریکہ کے حلیف ہیں؛ ماڈی وسائل کے محتاج ہونے کی وجہ سے یا پھر اپنی سیاسی ضرورت کی وجہ سے۔ ایک بات ان تینوں ممالک کی ایک جیسی ہے کہ انہیں اپنے عوام کی حمایت حاصل نہیں ہے، لہذا وہ اقتدار کے لیے ملک سے باہر دیکھتے ہیں۔ ترکی کا معاملہ عجیب ہے کہ وہ مکہ معاہدے کا بھی حصہ ہے اور نیٹو کا رکن بھی۔ وہ نیٹو جس کے سربراہ سے جب سوویت یونین کی تحلیل کے بعد پوچھا گیا تھا کہ نیٹو سوویت یونین کے خلاف بنا تھا، اس کے خاتمے کے بعد اب نیٹو قائم رکھنے کا کیا جواز ہے؟ تو اس نے کہا تھا کہ ابھی ہمیں مسلم بنیاد پرستوں سے لڑنا ہے۔ گویا ترکیہ دو کشتیوں کا سوار ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے کہا گیا تو جواب ملا کہ کسی بھی ملک پر پابندی نہیں کہ وہ کسی اور اتحاد کا حصہ نہیں ہو سکتا۔ گویا آپ سحر انگیزی اور شب زدگی کو ساتھ ساتھ لے کر بھی چل سکتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نہ تو اُمت کے بحیثیت مجموعی مفاد کا مسئلہ ہے اور نہ کسی پختہ اصول کو سامنے رکھا گیا ہے بلکہ صرف وقتی مفاد کے تقاضوں کے تحت یہ معاہدہ کیا گیا ہے۔ یعنی کسی کے اقتدار کو تحفظ مل جائے گا اور کوئی معاشی مسائل حل کر لے گا۔ اگر پوری اُمتِ مسلمہ کے مفاد کا سوال ہے تو پھر ایران کو بھی اس میں شامل ہونے کی دعوت دی جائے۔ وہ اگر شامل ہونے سے انکار کر دے تو الگ بات ہے لیکن ایک مسلمان ملک ہونے کے حوالے سے اسے معاہدے میں شرکت کی دعوت تو ملنا چاہیے تھی۔

درحقیقت ولی عہد نے اس معاہدے کے لیے بنیاد اور اہم ترین کردار ادا کیا ہے۔ ان کے سامنے حالیہ امریکہ اسرائیل ایران جنگ ہے، جو وقفے وقفے سے جاری ہے اور جس نے بالآخر ایک منطقی نتیجے تک بھی پہنچنا ہے۔ اس کے کسی بھی نتیجے کو سامنے رکھ کر سعودی عرب کے تحفظ اور ماہنامہ میثاق (85) ستمبر 2026ء

سلامتی کو یقینی بنانے کی ایک کوشش ہے جو وہ کر رہے ہیں۔ اگر ایران کو خدا نخواستہ شکست فاش ہوتی ہے، یا امریکہ اور اسرائیل وہاں رجم چنچ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو سعودی عرب کے لیے ایران کا خطرہ ٹل جائے گا لیکن اسرائیل کا خطرہ بہت زیادہ بڑھ جائے گا۔ اس صورت میں پاکستان اور ترکیہ جیسے عسکری لحاظ سے مضبوط ممالک سعودی عرب کو اسرائیل سے بچائیں گے۔ دوسری صورت میں اگر امریکہ اور اسرائیل کو پیچھے ہٹنا پڑ جاتا ہے اور ایران ایک بہت مضبوط ملک کی حیثیت سے خطے میں کنٹرول حاصل کرتا ہے تو پاکستان اور ترکیہ اس معاہدے کی رو سے سعودی عرب کو ایران اور اس کی پراکسیز سے بچانے کے پابند ہوں گے۔

راقم عرض کرنا چاہتا ہے کہ یہ اتحاد اُمت کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اُمتِ مسلمہ ہے کہاں؟ مسلمان ممالک ہیں جو اپنے اپنے تحفظ کے لیے سرگرداں ہیں۔ مسلمان ممالک کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ کسی ایک ملک میں بھی صحیح قسم کی جمہوریت نہیں۔ سعودی عرب میں بادشاہت ہے۔ پاکستان اور ترکیہ میں جمہوریت ہے، مگر درحقیقت نہیں ہے۔ پاکستان کی صورت حال تو سب کے سامنے ہے۔ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہاں اصل حکمران کون ہیں! ترکیہ میں بھی عوام بہت بڑی سطح پر طیب اردوان سے بے زار ہیں۔ کوئی یہ بات فراموش نہیں کر سکتا کہ زمانہ جو کروٹ لے چکا ہے، اس کے مطابق ہر ملک کی سلامتی کے لیے دو چیزیں لازم و ملزوم بن چکی ہیں۔ اگر کسی ملک کی فوج کی پشت پر عوام ہے تو اس فوج کی کامیابی کے امکانات روشن ہیں، ورنہ ناکامی مقدر ہوگی۔ دوسرے یہ کہ اگر ملک میں عدل قائم ہے، عدالتیں آزاد ہیں اور اپنا فرض ادا کر رہی ہیں تو اس ملک کو کامیاب ہونے اور آگے بڑھنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔

اب ہم مکہ معاہدے میں بندہ جانے والے تینوں ممالک کے اندرونی حالات کا تذکرہ کرتے ہیں تاکہ آنے والے وقت میں ان کے اصل اور صحیح کردار کا تعین کیا جاسکے۔ جہاں تک سعودی عرب کا تعلق ہے، وہاں کے حکمران عوام کو مالی لحاظ سے بہت خوش رکھے ہوئے ہیں۔ انہیں کسی قسم کی تنگی نہیں آنے دی جاتی۔ کاروباری لوگوں پر کوئی انکم ٹیکس نہیں ہے۔ ایک زمانہ تک تو عوام کو بجلی وغیرہ بھی مفت مہیا کی جاتی تھی۔ عوام کی اکثریت کا مزاج بھی ایسا ہے کہ اگر کھانا پینا اچھا ہے تو سب اچھا ہے۔ البتہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سیاسی طور پر شدید گھٹن ہے۔ حکومت کے کسی بھی اقدام کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھا سکتا۔ پھر شاہی خاندان میں بہت اختلافات ماہنامہ میثاق (86) ستمبر 2026ء

ہیں۔ جہاں کہیں بادشاہت ہوگی اور جو افراد اقتدار میں براہ راست حصہ دار نہیں ہوں گے ان کے اعتراضات تو ہوں گے، اگرچہ اس وقت ولی عہد مکمل کنٹرول حاصل کر چکے ہیں۔ بہر حال یہ بات طے شدہ ہے کہ بادشاہت جہاں بھی ہوگی، اختلافات کی گنجائش نہیں ہوگی، جس سے حکومتی مخالفین کو اپنا غصہ یا غبار نکالنے کا موقع نہیں ملتا۔ اس طرح مخالفین اور ان کے حمایتی حکومت ہی نہیں ریاست کے خلاف بھی اقدام کرتے نظر آتے ہیں۔ حقیقت میں فی الحال سعودی عرب کی موجودہ حکومت کو داخلی سطح پر بظاہر کوئی خطرہ نہیں ہے۔

ترکیہ اور سعودی عرب کا کسی دفاعی معاہدہ میں بندھنا بھی گویا تاریخ کو ریورس گیر لگانے والا معاملہ ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرے کہ عربوں نے طویل جدوجہد اور بعض بیرونی قوتوں سے مل کر ترکوں کو عرب سے نکالا تھا۔ ترکوں اور عربوں کی دشمنی کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ ترکوں کے مطابق، عربوں نے خلافت عثمانیہ کو تباہ و برباد کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا تھا۔ مکہ معاہدہ اگر یہ دشمنی ختم کر داتا ہے تو یقیناً ایک مثبت پیش رفت ہے۔ سوال صرف یہ ہے کیا تینوں اسلامی ممالک غیروں اور اسلام دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں؟ اس حوالے سے وہ اپنے تمام مالی اور عسکری مسائل استعمال کریں گے یا یہ محض ایک سوداگری ہے؟ ایک ملک مال کے بدلے دوسرے کی سلامتی کا تحفظ کرے گا، اور یہ ایک وقتی ضرورت ہے۔ کل کو وقت اور ضرورت بدل بھی سکتی ہے، کیونکہ مالی اور معاشی صورت حال ترکیہ کی بھی تسلی بخش نہیں ہے۔ البتہ جنگی ساز و سامان کی تیاری کے لیے ترکیہ کی ایک باقاعدہ اعلیٰ درجے کی صنعت ہے، ایک پیشہ ورفوج ہے جس کی قیمت ادا کر کے سعودی عرب اپنا تحفظ چاہتا ہے۔ راقم کی رائے میں مکہ معاہدہ اُمت کے مسائل اور حالات کو سامنے رکھ کر وجود میں نہیں لایا گیا بلکہ ان تینوں ممالک نے وقتی حالات اور ضروریات کو سامنے رکھ کر یہ معاہدہ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُمتِ مسلمہ اب صرف ایک نظری اور تخیلاتی شے ہے۔ مسلم ممالک کے اپنے مسائل اور ضرورتیں ہیں، جن کو مد نظر رکھ کر اپنے مفاد میں اقدام کیے جاتے ہیں۔ لہذا ”ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے“، والی بات کہیں نظر نہیں آتی۔

اب آئیے اس معاہدے کے تیسرے اور اہم ترین ملک یعنی پاکستان کے اندرونی اور بیرونی حالات کا جائزہ لے کر اس کے عملی کردار کا ذکر کرتے ہیں۔ راقم نے پاکستان کو اس ماہنامہ میثاق (87) ستمبر 2026ء

معاہدے کا اہم ترین رکن قرار دیا ہے تو اس کی ہرگز یہ وجہ نہیں کہ وہ خود پاکستانی ہے بلکہ سیدھی اور سادہ سی بات ہے کہ پاکستان اس معاہدے کا واحد رکن ہے جو ایٹمی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کی اسلحہ سازی کی صنعت ترکیہ سے اگر بہتر اور ایڈوانس نہیں تو کسی طرح کم بھی نہیں۔ پھر یہ کہ پاکستان کا جغرافیائی محل وقوع بڑا اہم بلکہ انتہائی اہم ہے۔ مشرق میں بھارت دنیا کی دوسری بڑی آبادی والا ملک ہے لیکن پاکستان کا پیدائشی دشمن ہے۔ مغرب میں افغانستان اور ایران ہیں۔ افغانستان وہ ملک ہے جسے عالمی طاقتوں کا قبرستان کہا جاتا ہے اور ایران ایسا اسلامی ملک ہے جس نے امریکہ جیسی عالمی قوت کو ناکوں چنے چوادیے ہیں۔ شمال میں چین ہے جو آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔ وہ چین جو صرف پون صدی پہلے اونیوں کا ملک سمجھا جاتا تھا اُس نے ہر شعبہ میں ترقی کی وہ منازل طے کی ہیں کہ دنیا ورطہ حیرت میں ہے۔ اُسے آج اقتصادی جنم کہا جاتا ہے، لیکن وہ جنگی صنعت میں بھی اتنی تیزی سے ترقی کر رہا ہے کہ امریکہ کو یہ خوف کھائے جا رہا ہے کہ وہ جلد ہر محاذ پر امریکہ کو پسپا کر دے گا۔

اس کے ساتھ ساتھ پاکستان کی فوج کی پیشہ ورانہ صلاحیت بھی زبردست ہے، خاص طور پر فضا، یہ کم از کم اسلامی ممالک میں اپنا ثانی نہیں رکھتی، گزشتہ سال مئی میں اُس نے اپنی کارکردگی سے روایتی حریف کو ذلت آمیز شکست دی تھی، جس کا طعنہ امریکہ کے صدر ٹرمپ بھی کئی مرتبہ بھارت کو دے چکے ہیں۔ لہذا پاکستان کو مکہ دفاعی معاہدے کا اہم ترین رکن کہنا حقیقت کا اظہار ہے۔ لیکن بدقسمتی سے پاکستان میں بدترین سیاسی عدم استحکام ہے۔ معاشی حالت اس قدر بگڑ چکی ہے کہ وہ کسی وقت بھی سلامتی کا مسئلہ بن سکتی ہے۔ خارجی حالات اور پاکستان کا جغرافیائی محل وقوع اسے ڈیفالٹ قرار دینے سے بچاتا ہے مگر نہ حقیقی طور پر اگر جی ڈی پی اور قرض کا تفاوت دیکھا جائے تو ہم کلینکل ڈیفالٹ کر چکے ہیں۔ سیاسی عدم استحکام خاص طور پر حکمرانوں اور عوام میں بعد اس درجے کا ہے کہ جسے بیان کرنے کے لیے حوصلہ درکار ہے۔ بلوچستان اور کے پی کے میں حکومتی رٹ پر ایک بڑا سوالیہ نشان لگا ہوا ہے۔ ان دونوں صوبوں میں دہشت گردی ایک ایسا معمول بن چکی ہے کہ پنجاب اور سندھ کے لوگ اب اس پر پریشان ہونے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے۔ عوام مہنگائی کی چکی میں بُری طرح پے جا رہے ہیں۔ ایسے میں وہ سیاست یا حالات کی سنگینی کی طرف توجہ دیں یا اپنے بچوں کی دو وقت کی روٹی کا سوچیں! ماہنامہ میثاق (88) ستمبر 2026ء

صرف پنجاب میں ایک کروڑ سے زیادہ بچوں کو نہ سکول مہیا ہے نہ وہ تعلیم کا سوچ سکتے ہیں۔

پاکستان کی داخلی صورت حال پر کسی غیر نے کیا تبصرہ یا تنقید کرنا ہے، ملک کے وزیر داخلہ جو حکومت میں طاقتوروں کے نمائندہ ہیں، وہ خود ایک تقریب میں موجودہ نظام کے ڈیفالٹ ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ہمارا نظام پوری طرح ناکام ہو چکا ہے۔ اگر یہی نظام چلتا رہا تو ۱۰ سال بعد بھی ہم یہاں بیٹھے حالات کا رونا رو رہے ہوں گے۔ مزید کہا کہ وزیر اعظم ۱۶، ۱۵ گھنٹے روزانہ کام کرتے ہیں، اگر وہ دن رات بھی کام کریں تو کوئی نتائج نہیں نکلیں گے، اس لیے کہ نظام ہی درست نہیں۔ سوال یہ ہے کہ نظام کی ناکامی کا ذمہ دار کون ہے؟ ظاہر ہے وہ حکومت اور اسٹیبلشمنٹ جو مکمل طور پر با اختیار اور عملی طور پر کرتا دھرتا ہے۔ یہ بھی فرمایا کہ پاکستان بننے کے بعد آبادی میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے لیکن صوبے وہی چار ہیں۔ جب تک چھوٹے یونٹ نہیں بنیں گے، کام کیسے چلے گا؟ اتنے بڑے صوبوں کی ایڈمنسٹریشن اچھی کس طرح ہو سکتی ہے۔ سارا بوجھ ایک آدمی پر ہے اور وہی داخلی اور خارجی سطح پر پاکستان کے لیے ڈٹا ہوا ہے۔ ظاہر ہے ان کی مراد آرمی چیف سے ہے۔

ان فرمودات پر اچھا خاصا رد عمل آیا۔ شریف حکومت نے اسے اپنے خلاف چارج شیٹ قرار دیا جبکہ پاکستان پیپلز پارٹی صوبوں کی تقسیم پر سختی پا ہو گئی۔ اس کا موقف ہے کہ بقایا پاکستان کو جتنے چاہے صوبوں میں تقسیم کرو، سندھ کسی صورت تقسیم نہیں ہوگا۔ بلاول بھٹو نے عرصے سے ایک ہی رٹ لگائی ہوئی ہے: ”مرسوں مرسوں سندھ نہ ڈیو“۔ شریفوں کی حکومت تو ٹھنڈا سا احتجاج رجسٹر کروا کر جھاگ کی طرح بیٹھ گئی کیونکہ کسی زمانے میں پنجاب میں پاپولر تھی، اب یہاں کوئی ان کا نام سننے کو بھی تیار نہیں۔ لہذا وہ تو جلد اسی تنخواہ پر کام کرنے کو تیار ہو گئی۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے زبردست سٹیٹنڈ کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ اسے احتجاج کرنے اور سختیاں برداشت کرنے کا تجربہ ہے، جس کا عملی مظاہرہ جنرل ضیاء الحق دور میں کیا گیا۔ پھر یہ کہ اس کے پاس سندھ کا رد بھی ہے۔ یہ کارڈ وہ اتنی خوب صورتی سے کھیلتی ہے کہ اسٹیبلشمنٹ بھی ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ ماضی میں اس نے دریائے سندھ سے نہریں نکالنے کے مسئلے پر مرکزی حکومت اور اسٹیبلشمنٹ کو اپنی بات ماننے پر مجبور کر دیا تھا۔ پیپلز پارٹی نے فوری ایکشن یہ لیا کہ صدر زرداری نے اپنی ناراضگی کا اظہار شروع کر دیا اور مرکزی حکومت کی طرف سے بھیجی

ہوئی سریوں پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاید صوبوں کے معاملے میں بھی حکومت اور اسٹیبلشمنٹ پاکستان پیپلز پارٹی کے سامنے ہتھیار ڈال دیں، کیونکہ وزیر داخلہ محسن نقوی نے ایک ایسا بیان دیا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ یعنی نہ نئے صوبے بنیں گے نہ شریف فیملی کی مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے خلاف چارج شیٹ کے حوالے سے کوئی عملی قدم اٹھایا جائے گا۔ گویا ان کے مطابق بھی ملک کی حالت سنورے نہ سنورے اقتدار کے شریکوں کو ناراض کر کے اقتدار کے حوالے سے کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لینا بلکہ صورت حال سے سمجھوتا ہی کرنا ہوگا۔ اصل مسئلہ اقتدار کا ہے، کرسی کا ہے، جبکہ اصول بننے ٹوٹتے رہتے ہیں۔ اس پر حکومت اور اسٹیبلشمنٹ سے اچھے تعلقات رکھنے والے ایک صحافی نے زبردست کالم لکھا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کوئی تبدیلی یا بہتری نہیں آئے گی لیکن حکومت یہی چلے گی۔

خارجی طور پر پاکستان کے حکمرانوں نے خود کو ایک عرصے سے امریکہ کے حوالے کر دیا ہوا ہے۔ اس کے بدلے میں امریکہ نے پاکستان کی ایک ایسی حکومت کو سرپرستی کی ضمانت دی ہوئی ہے جو عوام سے مکمل طور پر کٹ چکی ہے۔ بظاہر پاکستان میں ایک سولین حکومت ہے لیکن یہ حکومت وردی کی سرپرستی کے بغیر ایک گھنٹہ بھی نہیں نکال سکتی۔ پاکستان کا دیرینہ دوست چین جس کے بارے میں یوں تو کہا جاتا ہے کہ پاک چین دوستی کو ہمالیہ سے بلند اور شہد سے زیادہ میٹھی ہے، وہ پاکستان سے دور ہوتا نظر آ رہا ہے۔ سوا ارب ڈالر کے قریب وہ قرضہ جواب واجب الادا ہو رہا ہے، پاکستان کی بار بار کی درخواستوں کے باوجود رول اوور نہیں کیا جا رہا۔ سی پیک بھی پیک ہو چکا ہے، وہاں کسی بھی مرحلے پر کام ہوتا نظر نہیں آ رہا۔ یہ صورت حال پاکستان کو معاشی طور پر مکمل بگاڑ کی طرف لے جا رہی ہے۔ اب انحصار مکہ معاہدہ کے رکن سعودی عرب پر ہے۔ وہ مزید کچھ جھولی میں ڈالے گا تو معاشی سانس بحال ہوگا۔

اب اس کی طرف آتے ہیں کہ پاکستان کو مکہ دفاعی معاہدے سے کسی جنگ کی صورت میں کیا فائدہ یا نقصان ہو سکتا ہے؟ راقم کی رائے میں پاکستان مکہ دفاعی معاہدہ کر کے بری طرح پھنس گیا ہے، اس لیے کہ امریکہ اسرائیل ایران جنگ جو وقفے وقفے سے ہو رہی ہے اس کا آخری اور فیصلہ کن راؤنڈ اب چند دنوں یا ہفتوں کی بات ہے۔ اس جنگ کا فیصلہ اگر امریکہ اور

قوی مؤمن بنیے!

محمد عثمان عباس

کچھ سال قبل ایک معروف مفتی صاحب نے انٹرنیٹ پر ایک بیان میں ضمناً فرمایا کہ: ”انسان کو کسی بھی ایسے کام میں لگ جانا چاہیے جو اس کی قوم کی ترقی کا ذریعہ بنے۔ اللہ تعالیٰ کو قوی مؤمن پسند ہے اور اگر مسلمانوں میں کوئی قوم طاقت ور ہوگی تو وہ اللہ کو کمزور قوم کے مقابلے میں زیادہ محبوب ہوگی۔“ اس پورے بیان کا ایک چھوٹا سا کلپ سوشل میڈیا پر بہت وائرل ہوا۔ ہم اچھا لگمان کریں گے کہ شاید اس شارٹ کلپ کو سیاق و سباق سے پھیرا گیا ہو ورنہ اس پر بھی بات ہو سکتی ہے کہ کیا طاقت ور قوم سے معاشی اعتبار سے طاقت ور مراد ہے۔ بہر حال پھر اس کلپ کو پاکستان کے ایک بڑے ای کامرس ٹریڈر نے اپنے تبصرے کے ساتھ بطور دلیل شیئر کیا، کیونکہ موصوف کے خیال میں قوی مؤمن وہی ہے جو زیادہ مال دار ہو۔ اسی کڑی کی وجہ سے جدید پڑھے لکھے نوجوانوں میں ”قوی مؤمن“ کی اصطلاح اس خاص معنی کے ساتھ عام ہوئی۔

تحریر کا سبب: دو واقعات

جب راقم نے قرآن اکیڈمی ملتان سے رجوع الی القرآن کورس (پارٹ ون) کیا تو ایک دوست مولوی عبدالرحمن کے ساتھ مل کر ایک چھوٹا سا تعلیمی حلقہ بنایا۔ وہاں کے ایک نوجوان طالب علم نے مجھ سے بحث شروع کی کہ ”قوی مؤمن یعنی مال دار بنو“ میں نے صرف یہ سوال کیا: کیا آپ نے یہ بات فلاں مفتی صاحب کے شارٹ کلپ میں سنی ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ہاں! اس دن میں نے ارادہ کیا کہ اس موضوع پر کچھ لکھوں گا۔

دوسرا واقعہ برطانیہ میں مقیم ایک دوست سے گفتگو کے دوران پیش آیا۔ دنیاوی ترقی کے موضوع پر بات ہو رہی تھی تو انہوں نے مجھے ایک تحریر بھیجی جو حدیث ((الْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ)) ماہنامہ میناق (92) ستمبر 2026ء

اسرائیل کے حق میں نکلتا ہے تو اسرائیل ایک بہت بڑی طاقت بن کر ابھرے گا۔ ایسے میں اسرائیل لازماً سعودی عرب اور دوسرے خلیجی ممالک پر حملہ آور ہوگا اور امریکہ اس کا حلیف ہوگا۔ کیا اس صورت حال میں اسرائیل کے سعودی عرب پر حملہ کرنے پر پاکستان اسرائیل پر حملہ کر سکے گا؟ کیونکہ معاہدے میں یہ شرط ہے کہ ایک ملک پر حملہ تنہا نہیں ہوگا؟ اگر امریکہ اور اسرائیل پسپا ہو جاتے ہیں اور ایران فاتح کی حیثیت سے سامنے آتا ہے تو وہ یا اس کی پراسکیز کھل کر سعودی عرب پر حملہ آور ہوں گی۔ ایسے میں کیا پاکستان ایران سے جنگ کرے گا؟

یہاں اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اس جنگ کی وجہ سے ایران پاکستان کے عوام میں بہت پاپولر ہو چکا ہے۔ پھر یہ کہ اہل تشیع پاکستان میں بڑی تعداد میں ہیں۔ کیا انہیں ریاست مخالف ہونے سے روکا جاسکے گا؟ یوں ملک میں ایک بہت بڑی تقسیم نظر آئے گی جو قومی سلامتی کے لیے بہت بڑے خطرے کا نشان ہوگا۔ ان تمام حقائق کو مد نظر رکھ کر یہ بات سمجھ آتی ہے کہ جب تک تمام یا اکثر مسلمان ممالک بشمول ایران متحد نہیں ہو جاتے، ان کا سود و زیاں ایک نہیں ہو جاتا، وہ ملکی مفاد کی بجائے مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کو اپنا ہدف نہیں بناتے اُس وقت تک چند مسلمان ممالک کے دفاعی معاہدے سے حقیقی اور عملی طور پر کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا بلکہ نقصان ہو سکتا ہے۔ لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس معاہدے میں جلد از جلد مسلمان ممالک کی اکثریت شامل ہو جائے تاکہ یہ مسلمانوں کے لیے عملی اور حقیقی طور پر فائدہ مند ثابت ہو۔ واللہ اعلم! ❀

دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی مقبول عام تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

اشاعت خاص: 200 روپے اشاعت عام: 75 روپے

خَيْرٌ...)) کی بظاہر من مانی تشریح پر مشتمل لگ رہی تھی۔ مجھے وہ تحریر پڑھتے ہی اندازہ ہوا کہ غالباً چیٹ جی پی ٹی سے لکھی گئی ہے اور دوست نے اس کا اعتراف بھی کیا۔ چیٹ جی پی ٹی ایک مصنوعی ذہن ہے اور وہ اپنے صارف کے دیے ہوئے prompt اور رجحانات کے مطابق لکھتا ہے۔ بعد میں میں نے محض تجربہ کے طور پر اپنے اکاؤنٹ سے سوال کو تھوڑا تبدیل کیا اور پرامٹ بدل کر تو چیٹ جی پی ٹی نے تحریر بالکل اس کے برعکس کر دی جو میرے دوست نے بھیجی تھی۔

”قوی مؤمن“ کی اصطلاح کہاں سے لی گئی؟ شاید میں کبھی اس پر نہ لکھتا اگر اس خاص جدید طبقہ کی طرف سے قوی مؤمن کا اصل معنی صاف واضح کر دیا جاتا۔ پھر ضمناً ترغیب دلائی جاتی کہ آدمی حلال طریقوں سے مال حاصل کرنے کی کوشش کرے تاکہ خود کو زیادہ سے زیادہ عبادت کے لیے فارغ کر سکے۔ کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانے پڑیں۔ اپنے آس پاس کے لوگوں کی بھی مدد کر سکے اور دوسروں کے لیے روزگار کا ذریعہ بن سکے۔ قوی مؤمن کے اصلی معنی سے تقریباً صرف نظر کر کے اسے ہر صورت میں ”مال دار بننے“ میں سیکیڑ دیا جانا بہت بڑی جسارت ہے۔ یہ اصطلاح دراصل صحیح مسلم کی حدیث مبارکہ سے لی گئی ہے جس کا متن درج ذیل ہے:

((الْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ وَأَحَبُّ إِلَى اللَّهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيفِ، وَفِي كُلِّ خَيْرٍ، اخْرِصْ عَلَى مَا يَنْفَعُكَ وَاسْتَعِنْ بِاللَّهِ وَلَا تَعْجِزْ، وَإِنْ أَصَابَكَ شَيْءٌ فَلَا تَقُلْ: لَوْ أَنِّي فَعَلْتُ كَذَا وَكَذَا، وَلَكِنْ قُلْ قَدَرُ اللَّهِ وَمَا شَاءَ فَعَلَ، فَإِنَّ لَوْ تَفْتَحُ عَنِ الشَّيْطَانِ)) (صحیح مسلم: ۲۶۶۳)

”طاقت ور مؤمن اللہ کے نزدیک کمزور مؤمن کی نسبت بہتر اور زیادہ محبوب ہے جبکہ خیر دونوں میں (موجود) ہے۔ جس چیز سے تمہیں (حقیقی) نفع پہنچے اس میں حرص کرو اور اللہ سے مدد مانگو اور کمزور نہ پڑو (مایوس ہو کر نہ بیٹھ جاؤ) اگر تمہیں کوئی (نقصان) پہنچے تو یہ نہ کہو: کاش! میں (اس طرح) کرتا تو ایسا ایسا ہوتا بلکہ یہ کہو: (یہ) اللہ کی تقدیر ہے وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اس لیے کہ کاش (کہنا) شیطان کے عمل (کے دروازے) کو کھول دیتا ہے۔“

امام نووی رحمہ اللہ کی شرح

امام نووی رحمہ اللہ جو صحیح مسلم کے عظیم شارح بھی ہیں اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

ماہنامہ **میثاق** (93) ستمبر 2026ء

((المراد بالقوة هنا عزيمة النفس و القريحة في أمور الآخرة، فيكون صاحب هذا الوصف أكثر إقداماً على العدو في الجهاد، و أسرع خروجاً إليه و ذهاباً في طلبه، و أشد عزيمة في الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر، و الصبر على الأذى في كل ذلك، و احتمال المشاق في ذات الله تعالى، و أرغب في الصلاة و الصوم و الأذكار و سائر العبادات، و أنشط طلباً لها و محافظة عليها، و نحو ذلك...))

”یہاں قوت سے مراد نفس کی مضبوط عزمیت اور آخرت کے امور میں ذہنی پختگی ہے؛ اس وصف والا شخص جہاد میں دشمن کے مقابلے پر بڑھ چڑھ کر آتا ہے۔ جہاد کے لیے زیادہ جلدی نکلتا اور اس کی زیادہ طلب رکھتا ہے۔ وہ نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے میں سب سے زیادہ پختہ عزم رکھنے والا ہوتا ہے۔ اس راہ میں ہونے والی اذیت پر زیادہ صبر کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے مشقتیں برداشت کرتا ہے۔ نماز، روزہ، اذکار اور دیگر عبادات کی طرف زیادہ رغبت رکھتا ہے۔ ان کے طلب و محافظت میں زیادہ سرگرم رہتا ہے وغیرہ۔“

دیگر اہل علم کی توضیحات

بعض دیگر اہل علم نے اس قوت کو وسیع تر معنوں میں لیا ہے۔ اس کا خلاصہ میں نے قطر اوقاف کے زیر اہتمام ایک ویب سائٹ ”اسلام ویب“ سے لیا ہے کہ طاقتور مؤمن جو اپنے ایمان میں مضبوط ہو اور اپنے جسم اور عمل میں بھی طاقتور ہو اس کمزور مؤمن سے بہتر ہے جو اپنے ایمان میں کمزور ہو یا اپنے جسم اور عمل میں کمزور ہو۔ اس لیے کہ طاقتور مؤمن مسلمانوں کے فائدہ کے لیے کام کرتا ہے اور مسلمان اس کی جسمانی قوت، اس کی ایمانی قوت، اور اس کی علمی قوت سے عظیم فائدہ حاصل کرتے ہیں؛ اللہ کے راستے میں جہاد مسلمانوں کے مصالح کو پورا کرنے، اسلام اور مسلمانوں کا دفاع کرنے میں۔ یہ وہ چیز ہے جس کی کمزور مؤمن میں صلاحیت نہیں ہوتی۔ اسی اعتبار سے طاقتور مؤمن کمزور مؤمن سے بہتر ہے اگرچہ دونوں میں خیر ہے جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا۔ پس ایمان سراسر خیر ہے؛ کمزور مؤمن میں بھی خیر ہے، لیکن طاقتور مؤمن اپنے لیے اپنے دین کے لیے اپنے اہل و عیال کے لیے اپنے بھائیوں کے لیے اور اپنی ماہنامہ **میثاق** (94) ستمبر 2026ء

مکہ معاہدے پر خوشی کا اظہار ضرور کیا جانا چاہیے اسے ایک اہم پیش رفت بھی قرار دیا جاسکتا ہے، لیکن اسے اُمت کی نجات کا حتمی حل سمجھنا درست نہیں ہوگا۔ اسی طرح امریکی ردِ عمل پر مطمئن ہو جانا بھی دانش مندی نہیں۔ عالمی سیاست میں جب کوئی بڑی طاقت کسی اقدام کی تعریف کرتی ہے تو یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ اُس تعریف کے پس پردہ اُس کے اپنے مفادات کیا ہیں۔ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اگر کسی دفاعی معاہدے کی وجہ سے فی الوقت کسی فریق کو پریشانی نہیں ہو رہی تو اس کا مطلب لازماً یہ نہیں کہ وہ مستقبل میں بھی سب کے لیے بے ضرر رہے گا۔ اس لیے خوشی اور اطمینان کے حصول میں محتاط رہنا اور ہر پیش رفت کو اُمت کے وسیع تر مفادِ خود مختاری اور طویل المدت حکمت عملی کی کسوٹی پر پرکھنا بے ضروری ہے۔

مکہ مکرمہ سے شروع ہونے والا یہ دفاعی سفر اگر باہمی اعتماد، مشترکہ دفاع، معاشی تعاون، تکنیکی خود کفالت اور بالآخر اُمت کے وسیع تر اجتماعی مفاد کی طرف بڑھتا ہے تو یہ ایک نئے دور کا نقطہ آغاز بن سکتا ہے۔ اصل سوال یہ نہیں کہ دنیا اس معاہدے کو کیا نام دیتی ہے؛ اصل سوال یہ ہے کہ مسلمان خود اسے کس مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اگر مقصد صرف اپنے اپنے قومی مفادات کا تحفظ ہے تو پھر یہ محض ایک اور علاقائی اتحاد ہوگا، لیکن اگر اس کے ذریعے اُمت کے منتشر شیرازے کو جوڑنے، مظلوم مسلمانوں کے لیے مؤثر اجتماعی قوت پیدا کرنے اور عالمی سیاست میں باوقار و خود مختار کردار ادا کرنے کی راہ ہموار ہوتی ہے تو مکہ کا یہ معاہدہ ایک بڑے سفر کی ابتدا بن سکتا ہے۔ کیا اُمتِ مسلمہ دوسروں کے فیصلوں کا انتظار کرتی رہے گی یا اپنی قوت کو منظم کر کے اپنے مستقبل کے فیصلوں میں خود شریک ہوگی؟

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس معاہدے کو علامہ اقبال کی اس پیشین گوئی کا مصداق بنائے۔

عطا مؤمن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے

شکوہ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی!



اُمت کے لیے اس سے زیادہ خیر والا ہوتا ہے۔ اس حدیث میں قوت اختیار کرنے کی ترغیب ہے اور اسلام قوت، عزت اور سر بلندی کا دین ہے، ہر زمانے میں مسلمانوں سے ہر معاملے میں قوت حاصل کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَأَعِزُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ﴾ (الانفال: ۶)۔ قوتِ ایمان اور عقیدہ میں، قوتِ عمل میں، اور قوتِ جسموں میں؛ کیونکہ یہ سب مسلمانوں کے لیے خیر اور بھلائی کا سبب بنتے ہیں۔

اختتامی نکات

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں کئی حضرات مال داری کے اعتبار سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے آگے تھے لیکن اس کے باوجود اُمت کے اجتماعی فہم کے مطابق سب سے افضل، سب سے قوی ایمان والے اور سب سے بڑے درجے والے صحابی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں۔

ابھی ایک نوجوان عالم دین وسوشل میڈیا انفلوئنسر کی ویڈیو نظر سے گزری جس میں موصوف علم دین کے ساتھ skills سیکھنے اور پیسہ بنانے کی ترغیب دے رہے تھے۔ ظاہر ہے آج کل ایک عام آدمی پر معاش کا اتنا جبر ہے کہ سفید پوش طبقہ تو پس کر رہ گیا ہے۔ چنانچہ اس بات کی ترغیب دینی بھی چاہیے تاکہ لوگ کسل مندی کا شکار نہ ہوں، لیکن ساتھ ہی موصوف کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ کو طاقت و مؤمن پسند ہے اور انگلیوں سے پیسے گننے کا اشارہ کر کے فرمایا کہ طاقت و مؤمن سے یہ مراد ہے۔ کیا ان حضرات سے کوئی یہ پوچھ سکتا ہے کہ حال ہی میں اُمت کے ”طاقت و مؤمن“ مل کر اس قابل نہ تھے کہ خوراک رُخ بارڈر پار کروا کے فلسطینیوں تک پہنچا سکتے؟ راقم یہ بات کسی قسم کی مایوسی پھیلانے کے لیے نہیں عرض کر رہا، اور یہ دن ہیں جو اللہ تعالیٰ لوگوں کے درمیان پھیرتے رہتے ہیں کہ کبھی ایک کی فتح ہوتی ہے تو کبھی دوسرے کی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک کلام میں ارشاد فرمایا: ﴿وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَّوْلَهَا بَيْنَ النَّاسِ﴾ (آل عمران: ۱۴)۔ اللہ کی مدد و نصرت سے ان شاء اللہ سیاسی غلبہ بھی مسلمانوں ہی کا ہوگا لیکن ہمیں بھی چاہیے کہ اللہ کے دین کے ساتھ مخلص ہو جائیں۔ یہ کیسا طاقتور مؤمن ہے جس کے بینک اکاؤنٹ میں تو کروڑوں روپے ہیں لیکن اس کی ایمانی قوت اسے امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر آمادہ کرنا تو دور کی بات نماز فجر کے لیے اٹھانے میں بھی معاون نہیں؟





جدید تعلیم یافتہ حضرات و خواتین کے لیے دینی علوم کے حصول کا نامور موقع

جاری کردہ:
ڈاکٹر اسرار احمد

رجوع الی القرآن کورس

ان شاء اللہ

رجسٹریشن یکم رمضان سے شروع ہے۔

تعلیم : کم از کم انٹر میڈیٹ

عمر : کم از کم 22 سال

دورانیہ : 10 ماہ

انٹر کنٹیننٹ
کلاسز

انٹرویو: یکم ستمبر 2026ء

آغاز کلاسز: 2 ستمبر 2026ء

ایام تدریس: پیر تا جمعہ

اوقات تدریس: صبح 8:15 تا 1:00

عرصہ 44 سال
سے باقاعدگی سے
جاری تعلیمی سلسلہ

مضامین تدریس:

پارٹ ② (سال دوم) —

برائے مرد حضرات

- عربی زبان و ادب ● اصول تفسیر ● تفسیر القرآن
- اصول حدیث ● درک حدیث ● اصول الفقہ
- فقہ المعاملات ● عقیدہ (طحاوی) ● اضافی محاضرات

پارٹ ① (سال اول) —

برائے مرد و خواتین

- تجوید و ناظرہ ● عربی گرامر (صرف نحو)
- ترجمہ قرآن (مع تفسیری و لغوی توضیحات) ● دورہ ترجمہ قرآن
- قرآن حکیم کی فکری و عملی رہنمائی ● سیرت و شہل الہی (صلی اللہ علیہ وسلم)
- مطالعہ حدیث و اصطلاحات حدیث ● فکر اقبال
- فقہ العبادات ● معاشیات اسلام ● اضافی محاضرات

نوٹ: بیرون لاہور رہائشی صرف مرد حضرات کے لیے ہاسٹل کی محدود سہولت موجود ہے۔
لہذا خواہشمند حضرات پہلے سے رجسٹریشن کروائیں۔

email: irts@tanzeem.org

www.khuddamulquran.org

0316-1466611 042-35869501

مزید
تفصیلات
کلیں:

بمقام:

ڈاکٹر اسرار احمد کی خدمات قرآنی کا مرکز
(پیشہ)
مرکز قرآن و احکام لاہور
36-K ماڈل ٹاؤن لاہور

- قرآن مجید میں مستعمل الفاظ کی صرف و نحو کے اعتبار سے ترکیب
- ہر لفظ کی لغوی تحقیق اور صرفی و نحوی تحلیل، صیغہ اور لفظ کا اصلی مادہ
- متعلقہ مادہ سے قرآن حکیم میں آنے والے صیغوں کی تفصیل مع حوالہ
- سورہ کا ترجمہ زمانہ نزول و شان نزول سورہ کا موضوع اور خلاصہ مضمون

روح اللہ اس شخص دہریہ خصوصیات کی حامل
اپنی توجہ اور نظم سے عرب کی گئی قرآن مجید پر اردو کی کتاب

لغات و اعراب القرآن

جزء عم (سورۃ النبا تا سورۃ الناس)

ابوجنید ساجد افضل

گرامر کے اعتبار سے قرآن حکیم کا ترجمہ کئے گئے طے
اساتذہ طلبہ و عام قارئین کے لیے انتہائی مفید

● عمدہ طباعت اور مضبوط جلد

● قیمت: 3500

● صفحات: 1280

کتاب کے حصول کے لیے

● مکتبہ خدام القرآن: 36 کماڈل ٹاؤن لاہور (Whatsapp: 0301-1115348)

● مکتبہ سید احمد شہید: الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور ● مکتبہ رحمانیہ: غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

● مکتبہ القدوسیہ: غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور ● کتاب سرائے: الہمد مارکیٹ غزنی سٹریٹ لاہور

● مکتبہ اسلامیہ: کوتوالی روڈ بالمقابل کوتوالی پولیس سٹیشن، گھنہ گھر، فیصل آباد

Cash on Delivery: Whatsapp on 0312- 4842222 (Author)

Sep 2026
Vol. 75

Regd. CPL No.115
No.9

Monthly **Meesaq** Lahore



Kausar

BANASPATI & COOKING OILS

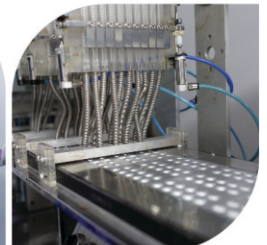
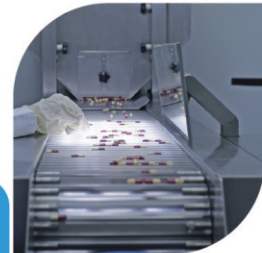
کچن خاص مہینے کا نمبر



f KausarCookingOils



Your Health
Our Devotion



NABIQASIM INDUSTRIES (PVT.) LTD.

Leading Pharmaceutical Manufacturing & Marketing Company, offering wide range of high quality branded generics in all therapeutic categories for domestic and international markets. Specializes in manufacturing complete range of Oral Solid Dosage, Syrups, Freeze Dried Lyophilized Injectables, Laxative Enemas, Effervescent Sachets, Dry Suspensions, Creams, Gels, Ointments, Vaginal Tablets including Hormonal Products, Oral Cephalosporin, Ophthalmic and Otic Drops, Creams and suspensions at its cGMP compliant manufacturing facility at Karachi, Pakistan. The company exports its branded generics to more than 40 countries in Asia, CIS, Middle East, Francophone Africa, Fareast, East & West Africa

INNOVATION

TECHNOLOGY

COMPLIANCE

www.nabiqasim.com